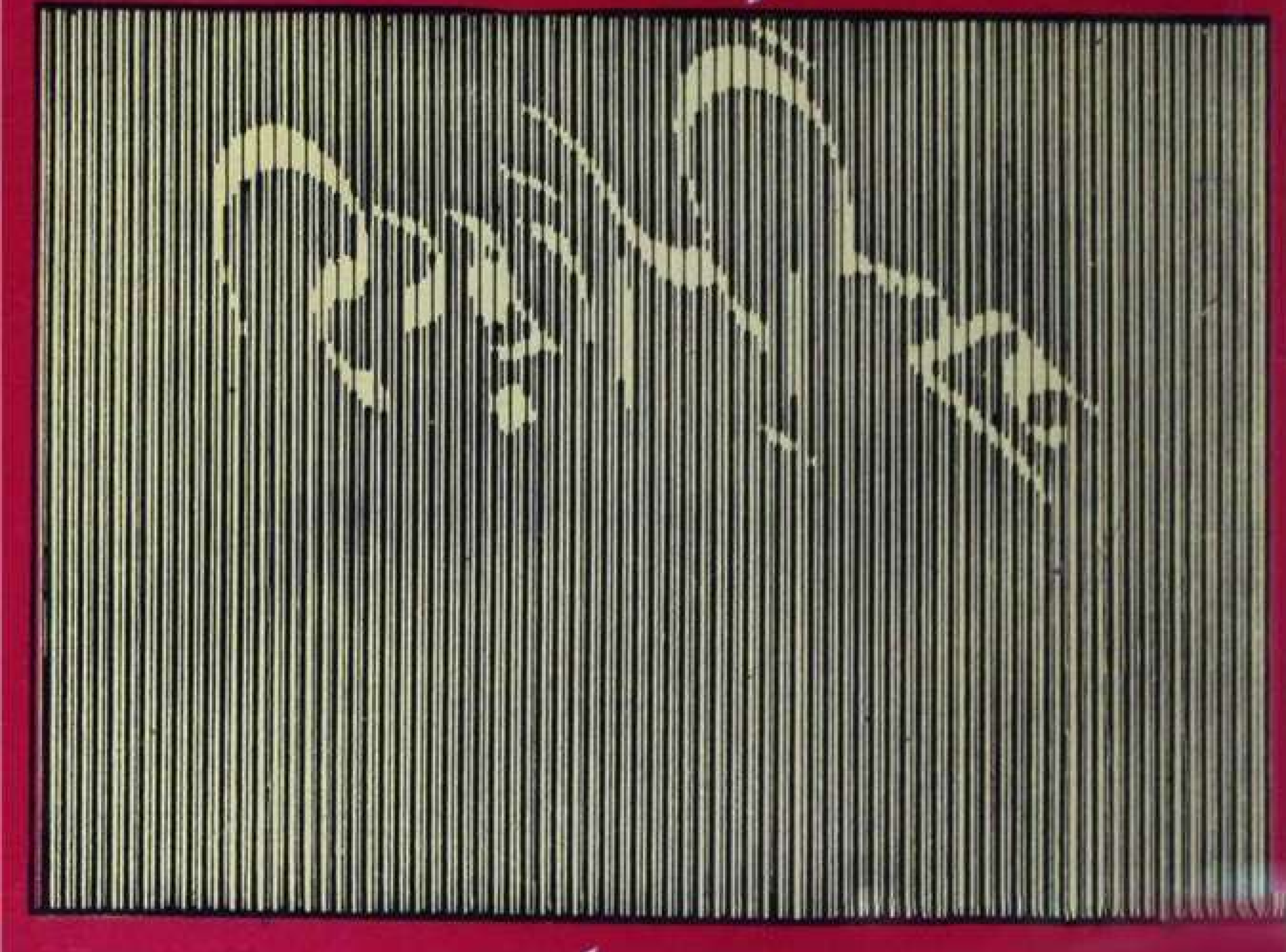
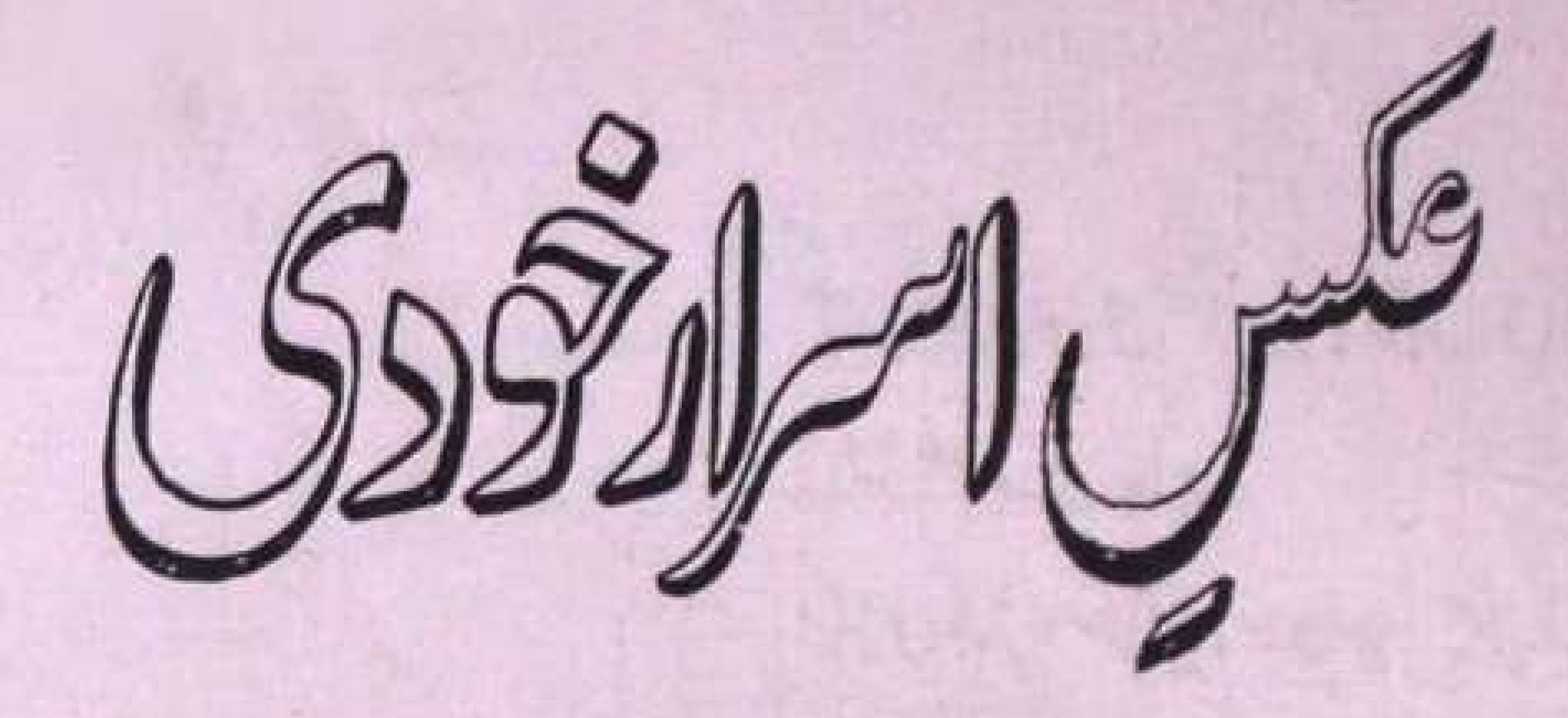
عکسِ اسرارِ خودی



ڈاکٹر عصمت جاوید

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی



علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ

مترجم

ڈاکٹر عصمت جاوید

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ ۹۷۸

نام کتاب : عکس اسرار خودی از : علامہ اقبال
مترجم : ڈاکٹر عصمت جاوید
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶

اشاعت :

طبع اوّل	جولائی سنہ ۱۹۹۱ء	۱۱۰۰
″ دوم	دسمبر سنہ ۱۹۹۴ء	۱۱۰۰

قیمت : ۱۴/- روپے

AKS-E-ASRAR-E-KHUDI [Urdu]

By Allama Iqbal

Translated by: Dr. Ismat Javed

Price: Rs. 14.00

مطبوعہ

دعوت آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"اسرار خودی" علامہ اقبال کی مشہور و معروف مثنوی ہے۔ مثنوی کیا ہے؟ قوم و ملت کے لئے ایک پیام بیداری۔ اس مثنوی کے ہر شعر سے شاعر کے دل کی تڑپ نمایاں ہے۔ اگر کوئی قوم احساس خودی سے خالی ہے۔ تو یقین کیجئے کہ ذلت و رسوائی اسکی قسمت بن چکی ہے۔ احساس خودی کا فقدان کسی بھی قوم و ملت کے لئے پیغام موت سے کم نہیں، وجود اور منشائے وجود کی تکمیل کیلئے خودی کا احساس لازمی ہے۔ اس کے بغیر گرمی حیات ہو یا سوز عشق سب ہی کچھ غیر معتبر قرار پاتے ہیں۔ خودی کے اپنے بنیادی تقاضوں کی طرف بھی علامہ نے اس میں نہایت مؤثر انداز میں اشارے کئے ہیں۔

علامہ اقبال کو شاعر اسلام، فلسفیٔ اسلام، مفکر اسلام وغیرہ کے خطابات سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے کلام کے مطالعے اور اشعار کی گہرائی سے جو بات مشاہدے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ علامہ پیغمبرانہ دعوت کے نکتہ رس اور دین کے زبردست مزاج شناس تھے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی دراصل خدا شناسی تک پہونچاتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ خود شناسی اور خدا شناسی کے بغیر حیات و کائنات کی کوئی بامعنی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ شاعر کے پیغام کو عام کیا جائے اور قوم خوابیدہ کو جگانے کی کوشش مسلسل جاری رکھی جائے۔ مثنوی کی زبان فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہ تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید جیسے شاعر نے اس مثنوی کا اردو منظوم ترجمہ پیش کر کے ہماری ایک بڑی ضرورت پوری کی ہے۔ اس منظوم ترجمہ کے پڑھنے سے اصل مثنوی کی سی حلاوت اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم کوئی ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ شاید ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب نے علامہ اقبال مرحوم کو خواب میں دیکھا ہو اور "اسرارِ خودی" کو نظم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہو بس علامہ مرحوم فوراً راضی ہو گئے ہوں اور خود اردو نظم میں سناتے گئے ہوں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اسے ذہن نشین کر لیا ہو اور صبح اٹھ کر حافظہ سے نقل کر دیا ہو۔ شاعر نے علامہ مرحوم کی زبان و بیان، انداز و لہجہ کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بہر حال "عکس اسرارِ خودی" آپ کے ہاتھوں میں ہے، توقع ہے کہ یہ منظوم ترجمہ اہل ذوق کے حلقہ میں شرف قبولیت حاصل کرے گا۔

محمد جاوید اقبال

مینیجر مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



برصغیر ہندوستان تاریخ کی معلومات افزا روشنی کے فوکس (Focus) میں مسلمانوں کی آمد کے بعد آیا۔ اس لئے کہ مسلمان کسی تاریخی بگولے کی مانند نہیں بلکہ ایک عالمگیر نظام تہذیب واقدار کی دعوت کے ساتھ آئے تھے اور ان کے تصورات ونظریات کے مجموعی خدوخال میں ایک ترقی یافتہ جدید تہذیب اور ایک بھرپور تمدن کے نقوش موجود تھے۔ وہ جہاں گئے، انہیں اعلیٰ تر اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی دعوت لے کر گئے۔ ظاہر ہے کہ اس تہذیب کی دعوت کی ابتدائی زبان عربی ہی تھی۔

مشہور ماہر لسانیات مولانا حامد علی خاں لکھتے ہیں [۱]

"غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے دو دور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک وہ دور جب مسلمان اس برصغیر کے حکمراں تھے اور دوسرا وہ دور جب وہ ایک غیر ملکی طاقت کے غلام بن گئے۔ ہندوستان آنے والے ابتدائی قافلوں کی زبان زیادہ تر عربی تھی اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان کافی عرصہ تک عربی رہی"۔

گویا مسلمانوں کے ابتدائی دور کی زبان عربی تھی اور یہ ایک فطری بات تھی اس لئے جہاں جہاں وہ حکمراں ہوئے اور وہاں مستقل آباد بھی ہو گئے وہاں کی مقامی بولیاں اپنی غیر ترقی یافتہ صورت میں بتدریج اپنی افادیت کھو کر ختم ہو گئیں اور عربی وہاں کی دفتری اور سرکاری زبان سے شروع ہو کر بالآخر کاروباری اور عوامی زبان بھی بن گئی۔ افریقہ کے بیشتر مسلمان ممالک

---

[۱] ماہنامہ الحمرا لاہور اکتوبر ۱۹۵۴ء

جہاں عربی بولی جاتی ہے ۔ اسی عمل میں سے گزرے ہیں ۔ مصر سوڈان ۔ تیونس ۔ مراکش ۔ الجزائر اور متعدد دوسرے ممالک جو جزیرہ نمائے عرب سے دور اور باہر ہیں انھیں مراحل سے گزر کر عربی بولنے والے ممالک بن گئے ہیں ۔

چنانچہ ابتدائی عربی قافلوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی زبان کافی عرصہ تک عربی رہی ۔ یہاں تک کہ وسط ایشیاء اور دیگر علاقوں سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ دوسری زبانیں بالخصوص فارسی اور تُرکی بھی ہندوستان میں انہیں کے ذریعے پہنچیں اور سولھویں صدی تک لسانی کشمکش اور اختلاط کے مختلف مراحل سے گزر کر بالآخر سیاسی حالات فیصلہ کن طور پر فارسی کے حق میں ہو گئے ۔ پھر سارے مسلم ہند نے فارسی کو اپنا لیا اور وہ یہاں کی سرکاری دفتری زبان بھی بن گئی ۔ چنانچہ فارسی تقریباً تین سو سال کے لئے برصغیر ہندوستان کی سب سے اہم علمی زبان رہی ۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تصنیف و تالیف کا دینی کام تو عربی میں ہوتا رہا لیکن ان کے شعر و ادب اور معاشرت کی زبان کے علاوہ دفتری سرکاری زبان فارسی ہو گئی ۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری جو اسلامی قانون میں حنفی تصور تعبیر کی بہترین کتاب ہے وہ عربی میں تالیف ہوئی اور مکتوبات مجدد الف ثانیؒ جو مجدد صاحبؒ کی اسلامی تحریک احیائے دین کے حوالے سے عام قائدینِ حکومت اور عوامی معززین کو لکھے گئے مکاتیب ہیں وہ فارسی میں تحریر ہوئے ۔ فارسی خط و کتابت تو انگریزوں کی آمد کے بعد بھی برسوں تک جاری رہی اور فارسی زبان کا جاننا اس دور میں ایک شخص کے تعلیم یافتہ ہونے کی دلیل شمار ہوتا رہا ۔

علامہ اقبالؒ ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کے آخری دور کے بھی آخری کنارے پر کھڑے ہیں اس لئے ان کا دور لسانی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے ۔ ابتدائی شعری دور میں انھوں نے فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا ۔ ان کے خیال میں ان کے افکار و تصورات کی ترجمانی کے لئے اردو کا دامن الفاظ بہت تنگ تھا ۔ لیکن اب اردو کا دور شروع ہو چکا تھا اور شعر و ادب کے بیشتر اہلِ قلم اردو کو ہی ذریعۂ اظہار بنا رہے تھے اس لئے اپنی ملت کو مخاطب کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے بھی اردو کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا چونکہ مسلسل غور و فکر اور اُمت مسلمہ کے مطالعۂ حالات کے بعد وہ ایک پیغام کے حامل شاعر بن گئے تھے

اس لئے انہیں اسی زبان کو بالآخر اپنے پیغام کے لئے اختیار کرنا پڑا جسے ان کی ملت کے بیشتر تعلیم یافتہ لوگ سمجھ سکتے تھے۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کی تحریک ہائے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کو یہی زبان کام آئی تھی۔ "مسلمانوں نے من حیث القوم برصغیر ہند کی متعدد زبانوں میں سے اردو زبان پر ہی قناعت کی اور اسے اپنی پوری متاع سپرد کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور موثر ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبان کی اپنی خوبیاں تھیں کہ اس نے بہت جلد "لنگوفرانکا" کا درجہ حاصل کر لیا اور دوسری قوموں کے لئے جہاں ان کا تخاطب عوام سے ہوتا۔ اس زبان کا استعمال ناگزیر ہوگیا۔ اردو نے ہر موقعہ پر عوامی رابطے کا فریضہ ادا کیا۔ اور آج بھی پورے برصغیر میں رابطہ کی زبان اردو ہی شمار ہوتی ہے"۔ [1]

چنانچہ جب فارسی کا دور ختم ہوا اور برصغیر میں بے شمار لائبریریوں میں روزمرہ استفادے کی عربی فارسی کتب صرف آثار قدیمہ کا مال اور ریسرچ اسکالرز کا موضوع بننے لگیں تو اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں دیکھنے اور پڑھنے کا ذوق بھی ترقی کر گیا۔ اقبال کے کلام نے غیر معمولی انقلابی جذبات پیدا کئے۔ ایک مایوس ملّت کو امید افزا مستقبل سے مالامال کیا اور خاک کی مادی پستی سے اٹھا کر افلاک کی روحانی بلندیوں تک پہنچانے کا عمل سرانجام دیا۔ اقبالؒ کے اس جانفزا عمل نے دردمند دل رکھنے والے اہل قلم کو آمادہ کیا کہ وہ اقبال کے فارسی کلام کو بھی اردو میں منتقل کریں۔ اقبال کی طاقتور ملّی شاعری نے اسے دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے رجحان کو جنم دیا یہ عمل اقبال کی زندگی میں ہی بروئے کار آنا شروع ہوگیا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد تو اس پیغام بر شاعر کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے کا رجحان مزید بڑھ گیا۔ اقبال کا کلام پیغام کا حامل اس لئے قرار پایا کہ اس میں ملّت کے مسائل کا شعور موجود ہے۔ ان مسائل کے حل کے واضح خطوط موجود ہیں اور انہیں خطوط کے سبب اس کا کلام مقصدی فن کا حامل شمار ہوتا ہے۔ سیّد قطب شہیدؒ نے خوب کہا ہے۔

"اسلامی فکر سے ابھرنے والا ادب یا فن مقصدی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام زندگی کو مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی تحریک دیتا ہے۔ اسے کسی مخصوص دور میں یا کسی خاص لمحہ میں

---

[1] "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" مؤلفہ ڈاکٹر معین الدین عقیل

جو کچھ عملاً پایا جاتا ہے اس پر قانع ہو جانا نہیں آتا۔ اس کا تو کام ہی موجود کو بدلنا اور بہتر بنانا ہے۔ اس کا مستقل پیغام یہ ہے کہ زندگی کی تعمیرِ نو اور تشکیل جدید کا کام ہر آن جاری رہے۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اقدار کا شاعر ہے۔ ابدی حقیقتوں کا علمبردار ہے۔ وہ قدریں جو دل و دماغ اور روح میں پرورش پاتی ہیں۔ عقیدے کی سچائیوں سے جنم لیتی ہیں۔ اور بدن کے کپڑوں کی طرح نہ پھٹتی ہیں، نہ میلی اور پرانی ہوتی ہیں۔ وہ چاند سورج اور ستاروں کی طرح روشن، بلند اور ابدی وجود رکھتی ہیں۔ نئے اور پرانے کی تقسیم کو اقبال خود دلیلِ کم نظری قرار دیتا ہے۔

اقبال کا ایک فکری محور ہے جس سے وہ انحراف نہیں کرتا اور اپنے سارے سرمایۂ افکار کو اسی لنگر کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔ اس صدی کی تاریخ ادب گواہ ہے کہ اقبال نے نصف صدی کے لگ بھگ ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا عظیم الشان کام کیا ہے۔ اس کے فکری سفر میں اسلام کی طرف ایک تدریجی ارتقاء موجود ہے۔ لیکن اس کی تعلیمات کا فکری محور اول روز سے آخر دم تک اسلام ہی رہا ہے۔ اقبال اپنے دور میں مسلم ذہن پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے، وہ آنے والے دورِ اسلام کا طائر پیش رو ہے۔ وہ یاس و قنوط کا نہیں امید و بیم کا شاعر ہے۔ وہ کم از کم ایک صدی مستقبل کو دیکھنے کی دور بینی نظر رکھتا ہے۔

کسی قوم کی متاعِ بے بہا مادے کے وہ بھاری بھر کم تودے نہیں ہوتے، جو اس کی سرزمین کے طول و عرض میں کارخانوں، آبی بند، نہروں، جھیلوں اور مادی ترقیات کے منصوبوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ وہ عالی دماغ افراد اور ان کے علمی، فکری اور تخلیقی کارنامے ہوتے ہیں جو قوم کے وجودِ معنوی میں نو بہ نو زندگی کی لہریں بن کر دوڑتے اور اسے زندہ و پائندہ رکھتے ہیں۔ معاشی وسائل کا کسی قوم کے وجودِ ملی میں وہی مقام ہے جو جسم میں پیٹ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ فکری تخلیقات کا منبع جسم انسانی میں بلند ترین

---

[1] "جستجو"، ڈاکٹر تحسین فراقی ص ۔ ۱۸

مقام پر رکھا گیا ہے۔ اسی حقیقت کے ادراک کے بعد ایک عظیم برطانوی مدبر نے کہا تھا کہ "دسیع برطانوی سلطنت کے مقابلے میں شیکسپیئر کا وجود میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہے" اور اسی احساس کے تحت محمد علی جناح نے بھی ۲۴ مارچ ۱۹۴۵ء کو "یوم اقبال" پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اگر میں مسلمانوں کے نصب العین "اسلامی ریاست" کے حصول تک زندہ رہا اور اس وقت مجھے اقبال کی تخلیقات اور مسلم ریاست کی حکمرانی میں سے کسی ایک کو چننے کے لئے کہا گیا تو میں اول الذکر کو ترجیح دونگا۔"

نوع انسانی میں فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مختلف مدارج ہیں، اور یہ رنگا رنگی اور بوقلمونی عرفان الٰہی کے لئے کائنات میں مہیا کردہ نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے۔ انسانوں کی اعلیٰ ترین قسم تو انبیاء ہوتے ہیں، جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہدایت و رہنمائی کا واسطہ بنتے ہیں اور پھر اس سے کم لیکن دیگر اقسام انسانی سے برتر مفکرین ہوتے ہیں جو اپنی اعلیٰ فکری صلاحیتوں، شخصی تجربات اور قلبی واردات کے آئینے سے بنی نوع انسان کو بلند پایہ تخلیقات اور ذہنی رہنمائی کا فکری سرمایہ بہم پہنچاتے ہیں لیکن ان دونوں میں بھی ایک عظیم فرق ہے۔ پہلی قسم کو خالق خود مشاہدۂ حق کرا دیتا ہے اور وہ اوّل روز سے ہی اپنے جس مقام بلند پر کھڑے ہوتے ہیں، اپنے آخری دم تک انسانیت کے قافلے کو اسی مقام بلند کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی عصری یا مادی تغیر ان کے ذہنی ارتقاء کا سہارا نہیں بنتا۔ بلکہ دست قدرت خود دستگیری کرتا ہے اور تاپنے کے لئے آگ تلاش کرنے والے کو خود قدرت کا ہاتھ تھام کر مشاہدۂ حق کے کوہ طور پر لا کھڑا کرتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کا انسان اپنے بہت سے فکری اور ذہنی تجربات خود کرتا اور بتدریج اکتساب وارتقاء کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ نبی اوپر سے ہدایت لے کر نیچے اترتا ہے اور گری ہوئی انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لئے سہارا دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اوّل روز سے ہی صحیح ترین مقام بلند اور اپنی آخری منزل پر کھڑا ہوتا ہے لیکن ایک فلسفی اور مفکر تدریجاً اکتسابی ذرائع سے فکری بلندیاں طے کرتا ہے اور اس مقام عالی کی طرف بتدریج چڑھتا رہتا ہے جو تمام بلندیوں سے آگے اور مزید

بلند تر ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے مدراس لیکچر میں اس عظیم صوفی کا ذکر کیا ہے، جس نے واقعہ معراج پر تبصرہ کرتے ہوئے حسرت سے کہا تھا "محمد، انعام الٰہی سے مشاہدۂ حق تک جا پہنچے اور پھر واپس لوٹ آئے۔ خدا کی قسم اگر میں اس مقام پر پہنچا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

علامہؒ نے اس روایت سے ایک نبی اور ایک صوفی کا فرق بیان کیا ہے ایک وہ انسان ہے جسے ساری انسانیت کی فکر ہے اور ساری انسانیت کی خاطر وہ اس عظیم اور انتہائی بلند مقام سے واپس عالم انسانیت کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی ذات فلاح انسانیت کے مقام عظیم پر فائز ہے۔

دوسرا وہ انسان ہے جو اس مقام بلند کے لئے شب و روز ریاضت اور سوز و تپش میں مبتلا ہے اور اگر اسے وہ مقام مل جائے تو فلاحِ ذات میں ہی اس کی ساری کائناتِ آرزو پوشیدہ ہے۔ پہلی قسم مخلوق خدا کی ہدایت کا وہ فریضہ ادا کرتی ہے، جو خالق کائنات کا اپنا کام ہے جو ان کے واسطے سے ہی انجام پاتا ہے۔ گویا انبیاء کا گروہ انسانوں میں ہدایت تقسیم کرتا ہے اور دوسرا گروہ خود ہدایت کا متلاشی اور طالب ہے لیکن ہدایت پا لینے اور اس کے لئے بھاری ریاضتیں برداشت کر لینے کی صلاحیتیں اس میں بہر حال سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔

البتہ حق و صداقت کی گود میں پیدا ہو کر بھی اس سے بے شعور رہنا ایک عامی کا مقام ہے۔ جس پر ایک عالی دماغ مفکر کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ حق کی جستجو ہستی کے پورے شعور کے ساتھ کرتا ہے تاکہ وہ اس کے حقیقی وجود سے خود آشنا ہو اور اس کا ادراک اسے اپنے حواسِ خمسہ کی طرح حاصل ہو جائے۔ اقبالؒ نے حق کی جستجو میں ایک طویل ذہنی سفر کیا ہے۔ بعض لوگ اس کے ذہنی سفر کی مختلف منازل کو اپنی کم فہمی سے اس کی حقیقی منزل قرار دے بیٹھتے ہیں اور پھر مختلف غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے اور دوسروں کو بھی ان میں مبتلا کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کی جستجوئے حق کو اس کا تلوّن (Inconsistency) قرار دیتے ہیں، حالانکہ جستجو کے مختلف مراحل کو عبور کرنے کے لئے ذہنی مقام کی تبدیلی

ناگزیر ہے یہ تلون نہیں ارتقاء ہے۔

اقبالؒ کا مقصدی استحکام، بلند پایہ کلام اور طاقتور پیغام ہی ایک حساس صاحب شعور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اقبال کے پورے کلام کو سامنے رکھ کر اس سے مستفید ہو۔ یہی چیز اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اگر ڈاکٹر عصمت جاوید جیسی باصلاحیت شخصیت میں یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو مقصدی کلام کو اس کے مقصد اور پیغام کے قریب تر پہنچانے کے لئے شعر کا لباس پہنانا ان کا فرض بن جاتا ہے۔ یہی ان کا کمالِ فن ہے کہ انہوں نے مقصدی کلام کو نثر میں ترجمہ کرنے کی بجائے منظوم پیرائے میں پیش کر کے مقصد، پیغام اور لطافتِ شعر کو یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

ترجمہ بعض حالات میں تخلیق سے مشکل تر کام ہے۔ ہر تخلیق اپنا پیرایہ بیان اور الفاظ خود اپنے ساتھ لاتی ہے اس لئے کہ تخلیق کی داخلی قوت الفاظ کو اپنے سانچے میں ڈھالتی چلی جاتی ہے۔ تخلیق کار اپنے تخیل اور تخلیق کے کارِ اظہار میں اس قدر گم ہوتا ہے کہ اسے پیرایہ اظہار اور انتخاب الفاظ کا عمل سرانجام دینے کی مہلت کم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فطری انداز میں خود بخود تشکیل پاتے ہیں جس میں تخلیق کار کا شعوری ارادہ بہت کم کام کرتا ہے لیکن ترجمہ اس سے مختلف عمل ہے اس میں تخلیق کار کی داخلی قوت کی امداد شامل نہیں ہوتی اور ایک زبان کے اظہارِ بیان اور الفاظ کو کسی دوسری زبان کے اجنبی الفاظ اور پیرائے میں لانے کا عمل سرانجام دینا پڑتا ہے یہ داخلی تخلیقی قوت کی امداد کے بغیر خالص ایک فنی اور مشاقی پر مشتمل عمل ہے جو میری رائے میں مشکل تر کام ہے۔

ترجمہ بلاشبہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور جو شخص یہ چیلنج قبول کر کے آگے بڑھتا ہے وہ بڑے دل گردے کا ادیب و شاعر ہوتا ہے۔ ایک شخص خواہ دونوں زبانوں کا کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو مختلف اور متنوع موضوعات کا ترجمہ یکساں مہارت اور خوبی سے نہیں کر سکتا بلکہ ترجمہ تو ایک طرف، اصل مصنف کی فنی استعداد تک پہنچنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ اچھا مترجم وہی ہو سکتا ہے جو مصنف کی شخصی اور ذاتی وحدت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اشتراک رکھتا ہو یا کم از کم کوشش کر کے دونوں شخصیتوں کو مشترک بنا سکتا ہو۔

عصرِ جدید میں جتنی اہمیت علامہ اقبال کے فکر و فن کو حاصل ہوئی ہے اتنی کسی اور مفکر اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اقبال کے افکار و اشعار نے پورے عالمِ انسانیت کو متاثر کیا ہے اور ان کے نظریات سے اختلاف رکھنے والوں نے بھی ان کے شاعرانہ محاسن اور فکر کی گہرائی کو سراہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال جہاں انسان کو حسن و جمال، مناظرِ فطرت اور روحانی سکون سے نوازتا ہے، وہاں زیر دستوں اور محکومی و مقہوری سے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے مژدۂ جانفزا بھی ہے۔

عہدِ اقبال بلاشک و شبہ عالمی تحریکات، جنگ و جدل، آزادی کی طلب اور فکری و نظریاتی تحریکوں سے عبارت رہا ہے۔ علامہ اقبال اس دور کے بدلتے ہوئے ہر لحظہ سے باخبر رہے اور انہوں نے عہدِ رفتہ کی عظمتوں کو بھی پیشِ نظر رکھا اور آنے والے سنہرے دور کی نشاندہی بھی کی جس کی شہادت ان کی ہر نثری اور شعری تحریر میں مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر میں اقبال نسلِ انسانی کے ایک مفکر ہی نہیں ایک مصلح اور نجات دہندہ کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ جیسے کسی مسافر کو شجرِ سایہ دار مل جائے۔ چنانچہ علامہ اقبال کی عالمی مقبولیت بتاتی ہے کہ جب انہوں نے یہ کہا تھا کہ۔

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

تو کوئی غلط نہ کہا تھا بلکہ اپنے بین الاقوامی مشن کا اظہار کیا تھا۔ علامہ اقبال اس اعتبار سے بے حد خوش نصیب ہیں کہ ان کے کلامِ دلنواز کا ترجمہ ان کی زندگی میں ہی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر عصمت جاوید نے اردو ترجمے کے لئے علامہ اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی اسرارِ خودی کا انتخاب کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ مثنوی علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کو بیان کرنے کے لئے ان کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے۔ پھر اسی اسرارِ خودی کی لے آگے بڑھ کر ان کے سارے کلام اور فلسفہ زندگی میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔

علامہؒ اقبال کی یہ سب سے پہلی شعری تصنیف "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع

ہوئی تھی۔ شائع ہوتے ہی یہ مثنوی برصغیر کے اہل علم و تصوف کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کا سبب "اسرار خودی" کا موضوع اور علامہ اقبال کے مجتہدانہ خیالات تھے تاہم اس وقت کسی شخص کو بھی اسے اردو میں منتقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اس لئے کہ اس وقت فارسی علمی زبان تھی اور قریب قریب ہر تعلیم یافتہ شخص اسے بآسانی سمجھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر نکلس وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی علامہ اقبال کی کسی تصنیف کا کسی زبان میں پہلا ترجمہ تھا اور تراجم اقبال کے اس سلسلے کا آغاز بھی اس کتاب کے ترجمے سے ہی ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

آج اقبال کی نظم و نثر کے تراجم دنیا کی بائیس۲۲ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان میں اردو، انگریزی، اطالوی، انڈونیشی، بنگالی، ازبک، تاجیک، بنگالی، پشتو، پنجابی، ترکی، جرمن چیک، چینی، سندھی، سویڈش، روسی، عربی، فارسی، فرانسیسی، کشمیری اور گجراتی زبانیں بطور خاص شامل ہیں۔ بعض زبانوں میں اقبال کے مکمل مجموعہ ہائے نظم اور بعض میں محض انتخاب شائع کئے گئے ہیں۔

زیر بحث کتاب اسرار [illegible] زبانوں میں اب تک درج ذیل تراجم ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

(۱) اسرار و رموز — از عبدالرشید فاضل و کوکب شادانی ۱۹۷۶ء
شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور

(۲) ترجمانِ اسرار — از جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن
شائع کردہ مکتبہ کارواں۔ لاہور

(۳) اسرارِ اقبال — از حسین مہدی رضوی
شائع کردہ عاصم بہاری پبلیکیشنز۔ مراد آباد

(۴) ترجمانِ اقبال — از نظیر لدھیانوی
شائع کردہ مکتبہ کارواں کچہری روڈ۔ لاہور

اس میں شک نہیں کہ منظوم ترجمہ مشکل ترین اصناف سخن میں سے ہے۔ اس میں بسا اوقات کہنہ مشق

اور قادر الکلام اہل قلم بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مترجم بعض اوقات داد کی بجائے بیداد کا نشانہ بن جاتے ہیں ترجمہ فی الحقیقت ایک سعیٔ نامشکور ہے لیکن میں یہ لکھتے ہوئے باک محسوس نہیں کرتا کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس سعیٔ نامشکور کو سعیٔ مشکور بنا دیا ہے اور فارسی سے نابلد اردو داں قارئین اسے پڑھتے ہوئے ترجمہ کی خشکی کی بجائے تخلیق کی سرسبز اور روح پرور فضا میں اپنے آپ کو محسوس کریں گے اور اگر وہ علامہ اقبال کے فارسی کلام سے اس منظوم ترجمے کا موازنہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں تو وہ بے اختیار کہیں گے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس ترجمے میں علامہ کی تخلیق کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔
علامہ حسب خونِ جگر، اور نفس گرم کو تخلیق کا جوہر قرار دیتے ہیں۔

> ؎ رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
> معجزہ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

اسرارِ خودی کے مترجم ڈاکٹر عصمت جاوید کو یہ کیفیت حاصل ہے اسی لئے ان کے ترجمے نے تخلیق کا روپ دھار لیا ہے۔

اسرار خودی کے ایک دوسرے مترجم عبدالرشید فاضل نے جو اس کٹھن گھاٹی میں سے گزرے ہیں ان الفاظ میں اس راہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

"فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کرنا اور پھر نظم کا نظم میں اس لئے بھی بے حد مشکل ہے کہ فارسی کا ایک فقرہ بھی کبھی کبھی ایک پوری عبارت کا مضمون ادا کر جاتا ہے۔ ایک مصرع میں بعض اوقات معانی و مطالب کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ اردو میں یہ بات کہاں، اس کے علاوہ فارسی زبان کی شیرینی اور خیالاتِ عالیہ کو بیان کرنے کی قابلیت بھی ایک مسلّم امر ہے۔"[۱]

موازنے کے لئے اب ہم مترجمین اسرار کے تراجم کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔ آغازِ کتاب میں تمہید کے چند اشعار یہ ہیں۔

---

[۱] ۔ پیش لفظ "اسرار و رموز" منظوم ترجمہ علامہ عبدالرشید فاضل صفحہ ۳

اقبال ۔ (فارسی)

راہ شب چوں مہرِ عالمتاب زد | گریۂ من بر رُخِ گل آب زد
اشک من از چشم نرگس خواب شُست | سبزہ از ہنگامۂ ام بیدار رُست
باغباں روزے کلام آزمود | مصرعۂ کارید و شمشیرے درود

جسٹس رحمٰن (اردو ترجمہ)

متاعِ شب کو لوٹا جس گھڑی سورج کی کرنوں نے
دیئے چھینٹے رخِ گل پر چمن میں میرے اشکوں نے

جگایا چشمِ نرگس کو مری آنکھوں نے رو رو کر | اُگا سبزہ میری آواز سے بیدار ہو ہو کر
میرے زورِ سخن کی باغباں نے آزمائش کی | جہاں مصرع مِرا بویا وہاں شمشیر اگ آئی

اردو ترجمہ حسین مہدی

لٹ گئے جب لیلیٰ شب کے گہر | میرے اشکوں سے ہوئے گل خوب تر
میرے آنسو خوابِ نرگس لے اڑے | جاگ اٹھا سبزہ مری فریاد سے
میرے ہی زورِ سخن سے باغباں | بو کے مصرع لے گیا اک تیغ ریاں

اردو ترجمہ عبدالرشید فاضل

کاروانِ شب جو لوٹا مہرِ عالمتاب نے | چھینٹے مارے گل پہ میرے گریۂ بے تاب نے

چشمِ نرگس سے میرے اشکوں نے دھویا خواب کو
اور کہا سبزے سے نالوں نے کہ اب بیدار ہو

باغباں نے آزمایا جب مِرا زورِ کلام | بویا اک مصرع ملی حاصل میں تیغِ سبزِ خام

اردو ترجمہ نظیر لدھیانوی

شب لگی پیدا ہوئی تابِ سحر | میرے نالوں سے کھلا بابِ سحر
میرے ہنگاموں سے نرگس جاگ اٹھی | باغ کی خوابیدہ مجلس جاگ اٹھی
سبزہ تازہ میرے آنسو سے ہوا | پھول عطر آگیں میری بُو سے ہوا
کیا دکھایا ہے اثر گفتار کا | کام مصرع سے لیا تلوار کا

مار کر شب خوں جو نکلا آفتاب — کھل اٹھے اشکِ مسرت سے گلاب
خواب رخصت چشمِ نرگس سے ہوا — میرے نغمے سن کے سبزہ جاگ اٹھا
میں لٹاتا ہوں زرِ گل بے دریغ — شعر بو کر کاٹتا ہوں فصلِ تیغ

میرے سامنے ان پانچوں مترجمین کے منظوم ترجمے پڑے ہیں۔ اگر مجھے دیباچہ کی بجائے کوئی مقالہ لکھنا ہوتا تو میں موازنے کے لئے جابجا منظوم ترجمے کے نمونے دے کر بتاتا کہ ڈاکٹر عصمت جاوید کا ترجمہ فی الحقیقت علامّہ کے اشعار اور مفہوم و مطالب کی بہترین اور قریب ترین منظوم ترجمانی ہے۔ انھوں نے اپنے اس ترجمے میں 'دیر آید درست آید' کی صداقت کو اپنے اس ترجمے میں بہترین انداز میں منعکس کر دیا ہے۔ سادگیٔ بیان علامہؒ کے مفہوم سے قربت روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ مثنوی کی بحر کا بامقصد اہتمام ان کی قابلِ رشک خصوصیت ہے جو اپنے اندر ترجمہ کی بجائے تخلیق کا رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ علامّہ اقبال کی اسرارِ خودی کے اب تک کے مشہور ترین اُردو مترجم خان اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کے منظوم ترجمے اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے منظوم ترجمے کے موازنے کے لئے اسرارِ خودی کی بعض نظموں کے تین تین ابتدائی اشعار کو ساتھ ساتھ پیش کر کے قاری کو موازنے کا موقعہ فراہم کروں ملاحظہ فرمائیے۔

ساقی نامہ

نظیر لدھیانوی

ساقیا جام مئے گلفام دے — اٹھ دوائے کاوشِ ایام دے
آبِ شعلہ ریز وہ زمزم نژاد — ہے گدا بھی اس کا رشکِ کیقباد
جو تخیّل کو کرے ہوشیار تر — دیدۂ بیدار کو بیدار تر

ڈاکٹر عصمت جاوید

ساقیٔ دلبر مجھے وہ جام دے — غم بھلا کر جو مجھے آرام دے
آبِ زمزم سے بنی ہو یہ شراب — جس کے آگے جامِ جم ہو آب آب

جس کو پی کر تیز تر ہو فکر تیز — دیدۂ بیدار ہو عشرت گریز

حیاتِ خودی و تخلیقِ مقاصد

نظیر لدھیانوی

مدعا سے زندگی کی ہے بقا — زندگی ہے کارواں، مقصد درا
زندگی کا مدعا ہے جستجو — زندگی کی جاں ہے سوزِ آرزو
زندہ رکھ دل میں تمنّا کا شرار — تا نہ بن جائے ترا پیکر مزار

ڈاکٹر عصمت جاوید

مدعا سے زندگی میں ہے بقا — کارواں کو مدعا بانگِ درا
جستجو سے زندگی وابستہ ہے — آرزو سے زندگی پابستہ ہے
آرزو دل میں سدا رکھ برقرار — ورنہ بن جائے گا جیتے جی مزار

عشق اور استحکام خودی

نظیر لدھیانوی

نور کا نقطہ ہے یہ نقشِ خودی — ہے اسی سے ہم میں سوزِ زندگی
عشق کی قوت سے ہے پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
عشق سے ہے اس کے جوہر میں خروش — اس کی مخفی قوتوں میں زور و جوش

ڈاکٹر عصمت جاوید

نور کا نقطہ بنا ہم میں خودی — خاک ہم، وہ ہے شرارِ زندگی
عشق کے باعث خودی پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر تابندہ تر
عشق سے ہے اس کے جوہر میں حیات — اس کے دل میں ارتقائے ممکنات

ان چند مثالوں سے آپ کو دونوں منظوم تراجم میں واضح فرق محسوس ہوا ہوگا۔ اب ہم مثنوی کے آخری عنوان "دعا" میں سے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

جناب نظیر لدھیانوی

اے کہ تن میں مثلِ جاں مستور ہے — دل میں پنہاں اور ہم سے دور ہے

نغمہ پیرا مجھ سے ہے عود حیات
موت تیری رہ میں محسود حیات
پھر سے تسکین دلِ ناشاد ہو
پھر سے دل کے قصر میں آباد ہو
پھر طلب کر ہم سے ننگ و نام کو
پختہ تر کر عاشقانِ خام کو
بخت کی بیداد سے لاچار ہیں
تو گراں تر اور ہم نادار ہیں

ڈاکٹر عصمت جاوید

اے دلآرام جہاں، جانِ جہاں
دور ہم سے کیوں ہے اے نزدیکِ جاں
نبض جاں چلتی ہے تیرے فیض سے
شمعِ جاں جلتی ہے تیرے فیض سے
راہ میں تیری اے مقصودِ حیات
موت بھی ہوتی ہے محسود حیات
پھر ہمارے سینے میں آباد ہو
تاکہ تسکینِ دلِ ناشاد ہو
پھر طلب کر ہم سے ننگ و نام کو
پختہ پھر کر دے مزاجِ خام کو
آج ہم رسوا سرِ بازار ہیں
تو گراں قیمت ہے، ہم نادار ہیں

اسی دعا کے آخری پانچ شعر ملاحظہ ہوں۔

نظیر لدھیانوی

مضطرب ہوں ایک ہمدم کے لئے
ایک دانا ایک محرم کے لئے
جو خرد ور بھی ہو دیوانہ بھی ہو
حرف ایں و آں سے بیگانہ بھی ہو
آگ اپنی اس کے دل میں ڈال دوں
طرحِ محشر آب و گل میں ڈال دوں
تاب دے کر اس کو مہ پارہ کروں
پھر میں اس میں اپنا نظارہ کروں
ڈھالوں اپنی خاک سے پیکر بھی آپ
اس کا بت بھی آپ ہوں آزر بھی آپ

ڈاکٹر عصمت جاوید

دیکھ مجھ کو لالۂ صحرا ہوں میں
ہے بھری محفل مگر تنہا ہوں میں
مجھ کو بھی یارب ہو اک ہمدم نصیب
جو ہمیشہ ہو مرے دل کے قریب
ایسا دیوانہ جو فرزانہ بھی ہو
فکرِ این و آں سے بیگانہ بھی ہو
اپنی ہُو دے کر اسے اپناؤں میں
دل کے آئینے میں اس کو پاؤں میں

پھر مری مٹی سے ایک پیکر بنے   جس کا میں اور جو مرا آزر بنے

ان اشعار کے مطالعہ سے خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے محفلِ مترجمین میں اگر اپنے پیش روؤں کے بعد قدم رکھا ہے تو میرِ محفل بن کر رکھا ہے۔ مضامین کے ترجمہ میں ان کی سلاست اور سادگی قاری کو ترجمہ کی خشک وادی سے تخلیق کی بوقلموں وادی میں لے جاتی ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ شاعر کی فکر کے سرچشمہ سے بلا اکراہ و مزاحمت مستفید ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید کی یہی خوبی ہے جو ان کے منظوم ترجمے کو اب تک کئے گئے تراجم میں حاصل محنت قرار دیتی ہے اور اس بات میں تو کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ اقبال کی فکر کا وہ حصّہ جو فارسی میں ہونے کے سبب جدید نسل سے اوجھل ہے اسے اُردو کا جامہ پہنا کر قارئین سے روشناس کرانا فارسی جاننے والی نسل کے ذمّے ان کے اخلاف کا قرض ہے جو ادا ہونا چاہئے اور خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اس قرض کو احسن طریقے سے ادا کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ جو اسلاف اپنے اخلاف کو فارسی سے نابلد رہ جانے کی قباحت میں مبتلا ہونے سے نہیں بچا سکے ان پر کم از کم اتنی ذمّہ داری تو عائد ہوتی ہے کہ وہ نسلِ نو کو علامّہ اقبال کی مجموعی فکر سے آشنا کرنے کے لئے اسے اردو کا خوبصورت جامہ پہنائیں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید نے یہ جامہ تیار بھی کیا ہے اور بلاشبہ اس کی خوبصورتی اور موزونیت کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اقبال کی فکر کا حقیقی محور بلاشبہ اسلام ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں منشی سراج الدین کے نام اپنے خط میں لکھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں جس کی اشاعت رسولِ اکرمؐ" کے منھ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک جملہ تصور کر لیا ہے اور ان کا یہ خیال، ایک حد تک درست بھی ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے منظوم ترجمے "اسرارِ خودی" میں

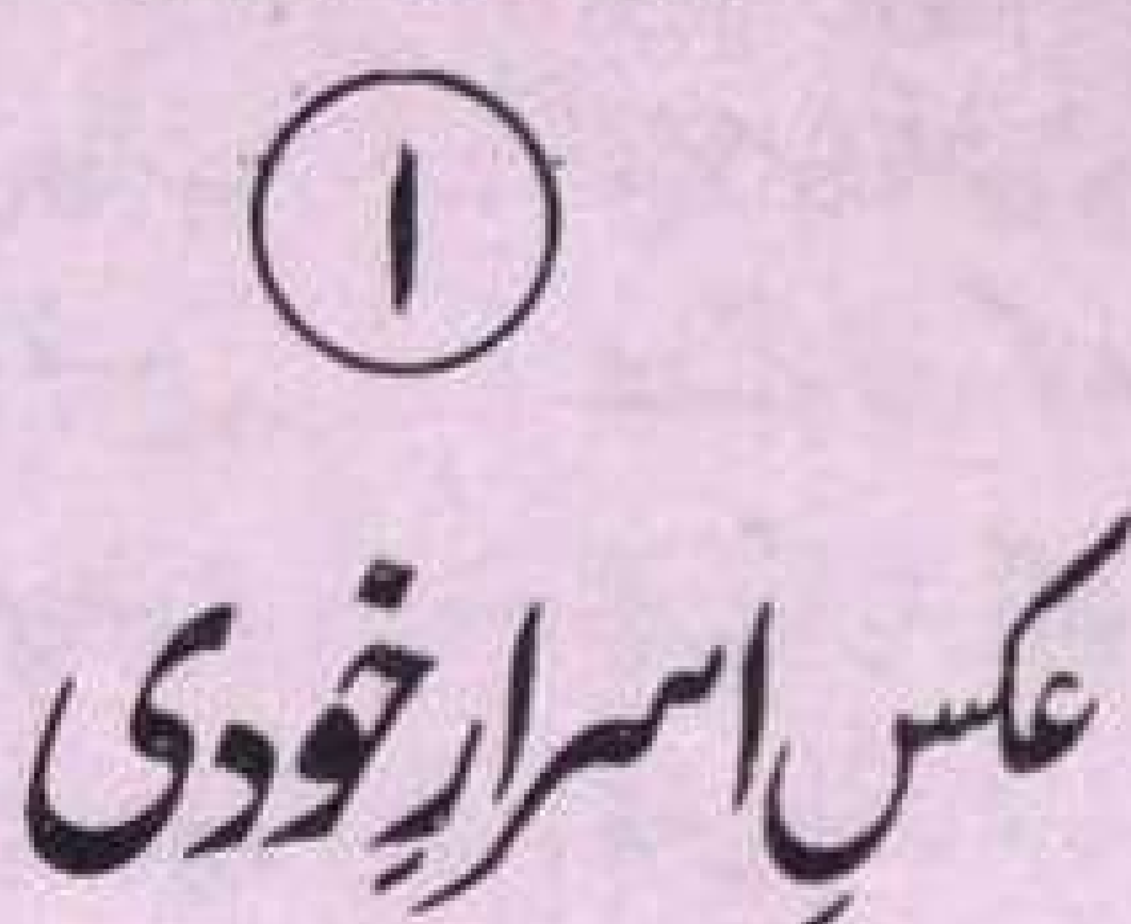
---

[۱] "اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ" ڈاکٹر عبدالشکور احسن۔ صفحہ ۱۸

علامہ اقبال کی اس بامقصد مقدس خواہش کا سب سے زیادہ احترام کیا ہے اسی لئے ان کے منظوم ترجمے نے ایک ایسے خلاء کو پُر کیا ہے جو علامہ کی تخلیق اسرار خودی کا مقصود تھا۔

احقر

(ڈاکٹر سید اسعد گیلانی)



عکسِ اسرارِ خودی

تمہید

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم
—— نظیریؔ نیشاپوری

مار کر شب خوں جو نکلا آفتاب — کھل اٹھے اشکِ مسرت سے گلاب
خواب رخصت چشمِ نرگس سے ہوا — میرے نغمے سن کے سبزہ جاگ اٹھا
میں لٹاتا ہوں زرِ گل بے دریغ — شعر بو کر کاٹتا ہوں فصلِ تیغ
میرے تخمِ اشک میں جوشِ نمو، — میرے نالے ہیں چمن کا تار و پو،
ڈالتا ہوں آفتابوں پر کمند — لاکھ صبحیں ہیں مری مٹھی میں بند
خاک میری جامِ جم سے پختہ تر — رازِ دو عالم کی رکھتی ہے خبر
ایسے آہو ہیں مرے فتراک میں — جو ہیں ناپیدا لباسِ خاک میں
سبزۂ نارستہ گلشن میں مرے — ہیں گل اندر شاخ دامن میں مرے

کرکے برہم محفلِ باغ و بہار — میں نے چھیڑا ہے رگِ عالم کا تار
سازِ فطرت ہے مرا نادر نوا — دوست نغموں سے مرے ناآشنا
اس جہاں میں مہرِ نوزائیدہ ہوں — رسم و آئینِ فلک نادیدہ ہوں
رم کریں انجم، کہاں مجھ میں وہ آب — ہے مری فطرت ابھی کم اضطراب
میں ابھی تک بحر پر آیا نہیں — بن کے لالی کوہ پر چھایا نہیں
پھر وہ کیا جانے مرا رقصِ ضیا، — پھر یہ کیا سمجھے مرا رنگِ حنا
مجھ سے نامانوس چشمِ ہست و بود — کانپ اٹھتا ہوں، وہ ہے خوفِ نمود
شبنمِ نو ہوں، برافگندہ نقاب — صبح دم نکلا ہوں مثلِ آفتاب
صبح خیزوں کا ہے مجھ کو انتظار — آگ ہوں! آتش پرستوں کو پکار
نغمہ ہوں، پر بے نیازِ ساز ہوں — شاعرِ فردا کی میں آواز ہوں
مثلِ یوسف کیا بکوں بازار میں — ہے زمانہ میرا اندھے غار میں
اور تہی داماں ہیں یارانِ قدیم — طور میرا آج بھی مانگے کلیم
میرے یاروں کا ہے دریا بے خروش — اور مرے قطروں میں ہے دریا کا جوش
دوسرا ہے میرے نغموں کا جہاں — یہ جرس اس کارواں کا ہے کہاں؟
کتنے شاعر مر کے زندہ ہو گئے — نیند سے ہم کو جگا کر سو گئے
مر کے وہ زندوں میں پھر سے آملے — پھول بن کر اپنی قبروں پر کھلے
ان کے کتنے کارواں گزرے خموش — جیسے اونٹوں کا خرامِ بے خروش
میں ہوں عاشق، نالہ ہے عادت مری — شورش و ہنگامہ ہے فطرت مری
میں وہ نغمہ، جو نہ سنبھلے ساز سے — ساز بھی ٹوٹے مری آواز سے
دور میرے زورِ طوفاں سے رہے — کہہ دو قطرے سے کہ دریا میں بہے
کیا سنبھالے زورِ بے پایاں مرا — بحر کے بس کا نہیں طوفاں مرا
جو کلی کھلتی نہ ہو گلزار وار — اُس پہ کیا ریجھے مرا ابرِ بہار

بجلیاں خوابیدہ میرے دل میں ہیں
کتنے طوفاں میرے آب و گِل میں ہیں

دشت تو، میں سیل، اے میرا اسلام
طور بن کر بڑھ، مری بجلی کو تھام

ہوں ازل سے محرمِ تابِ حیات
مجھ کو قدرت سے ملا آبِ حیات

میرا نغمہ سن کے، ذرّہ جی اٹھے
بن کے جگنو ہر طرف اُڑنے لگے

اس جہانِ راز میں میرے سوا
فاش رازِ زندگی کس نے کیا؟

سرِّ عیشِ جاوداں، آ مجھ سے سیکھ
دین و دنیا ساتھ پانا، مجھ سے سیکھ

بند میں رکھوں لبِ اعجاز کیا
کوئی اپنوں سے چھپائے راز کیا

ساقی دلبر مجھے وہ جام دے
غم بھلا کر جو مجھے آرام دے

آبِ زمزم سے بنی ہو یہ شراب
جس کے آگے جامِ جم ہو آب آب

جس کو پی کر تیز تر ہو فکرِ تیز
دیدۂ بیدار ہو عشرت گریز

کاہ کو جو کوہِ با عظمت کرے
بزدلوں میں شیر کی طاقت بھرے

خاک کو جو رفعتِ افلاک دے
ذہن کو اندیشۂ بے باک دے

جس سے قطرے کو ملے دریا کا جوش
ذرّۂ ناچیز ہو صحرا بدوش

جس سے خاموشی میں ہو محشر کا شور
جس کو پی کر باز پر جھپٹے چکور

ہاں اے ساقی وہ شرابِ ناب دے
جو شبِ اندیشہ کو مہتاب دے

میں کروں بھٹکے ہوؤں کی رہبری
دوں غلاموں کو میں ذوقِ سروری

جستجوئے نو کی میں دھن میں چلوں
آرزوے نو کی گرمی سے جلوں

چشمِ اہلِ ذوق کی پُتلی بنوں
گوشِ عالم میں صدا بن کر رہوں

روتی آنکھوں کو گُلِ لالہ کروں
قیمتِ جنسِ سخن بالا کروں

کھول دوں پھر لے کے نامِ پیرِ روم
دفترِ سربستۂ رازِ علوم

جانِ رومی میں دہکتے شعلہ زار
ہیں، فروغِ یک نفس، مثلِ شرار

شمع سوزاں آئی جب خود چل کے پاس
گم ہوئے پروانے کے ہوش و حواس

فیضِ پیرِ روم سے اکسیر ہے
خاک میں میری نمِ تعمیر ہے

میں کہ ذرّہ جب زمیں سے اڑ گیا
اپنے سورج سے بالآخر جڑ گیا

بحرِ رومی میں ہوں مثلِ موج، میں
گوہرِ نایاب جس کی تہہ میں ہیں

اس کے ساغر ہی سے پیتا ہے غلام
لے کے اس کی سانس جیتا ہے غلام

شب، مرا دل مائلِ فریاد تھا
نعرۂ "یارب" مجھے بس یاد تھا

شاکیٔ دوراں میں ہوتا تھا کبھی
خالی پیمانوں پہ روتا تھا کبھی

اِن خیالوں میں الجھ کر کھو گیا
پھر میں سوتے سوتے آخر سو گیا

خواب میں دیکھا کہ پیرِ معنوی
راقمِ قرآں بحرفِ پہلوی

کہہ رہا ہے مجھ سے اے بیتابِ عشق
کیوں نہیں پیتا شرابِ نابِ عشق؟

دل میں محشر کر بپا دیوانہ وار
نشترِ آنکھوں پر تو سر شیشے پہ مار

قہقہوں کو شورشِ جیحوں بنا
پھر جگر پاروں کو اشکِ خوں بنا

کیوں ہے چپ، منہ بند کلیوں کی مثال
عام کر دے، مثلِ گل، بوئے کمال

ہے سپندِ دل ترا ہنگامہ وار
آگ سے ہوتا نہیں کیوں ہمکنار

تو جرس ہے اپنا سرمایہ اچھال
نالۂ خاموش کو باہر نکال

آگ سے تیری ہو روشن یہ جہاں
عام کر دے اپنا تو سوزِ نہاں

فاش کر اسرارِ پیرِ مے فروش
جام میں اپنے سما جا بن کے جوش

فکر کے شیشے کی کیسی دیکھ بھال!
لا کے چوراہے پہ اُس کو توڑ ڈال

دے نیستاں کی خبر تو مثلِ نے
کچھ تو لیلیٰ کی سنا تو قیس ہے!

طرزِ نالہ اک نئی ایجاد کر
ہائے وہو سے بزم کو آباد کر

بن کے جانِ نو، ہر اک جاں میں سما
کہہ کے "قم" زندوں کو زندہ تر بنا

جادۂ نو کی طرف رخ موڑ دے — طرزِ رفتارِ کہن کو چھوڑ دے
چپ نہ رہ، رازِ دروں اب سب پہ کھول — تو درائے کارواں ہے، کچھ تو بول!

○

سن کے یہ بھڑکی مری رگ رگ میں آگ — مثلِ نَے، ڈھلنے لگے سینے میں راگ
بن کے نغمہ جب میں پھوٹا ساز سے — دم بخود سب تھے مری آواز سے

لے کے اپنے ہاتھ میں سازِ خودی
میں سنانے لگ گیا رازِ خودی

○

نقشِ ہستی میرا اک خاکہ سا تھا — ناقص و بے کار و ناکارہ سا تھا
جب تراشا عشق نے، آدم بنا — عالمِ کیف و کمِ عالم بنا
نبضِ گردوں کی سنی ہے گفتگو — چاند کی رگ رگ میں دیکھا ہے لہو
کتنا رویا ہوں میں انساں کے لیے — رازِ ہستی تب کہیں مجھ پر کھلے
میں نے دیکھی کارگاہِ ممکنات — میں نے کھولا سرِّ تقویمِ حیات
چاند اگرچہ ہوں اندھیری رات کا — ملتِ بیضا کا ہوں میں گردِ پا
ملتِ بیضا ہے مشہورِ جہاں — جس کے نغموں سے جہاں آتش بجاں
جس کے خرمن میں ہیں دانوں کی مثال — رومی و عطار جیسے باکمال
میں نکالوں آگ اپنے راگ سے — ہوں دھواں، لیکن ہے نسبت آگ سے
فیضِ فکرِ تیز سے میرا قلم — رازِ ہستی کھولتا ہے دمبدم

تاکہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے!
ذرہ پھیلے، پھیل کر صحرا بنے!

○

میں نے کی منظوم جو یہ مثنوی — اس سے کب مقصد ہے میرا شاعری

دیکھ اِس میں صرفِ جوشِ اندروں
بت پرستی، بت گری میں کیوں کروں

فارسی بولی سے میں بیگانہ ہوں
مثلِ ماہِ نو، تہی پیمانہ ہوں

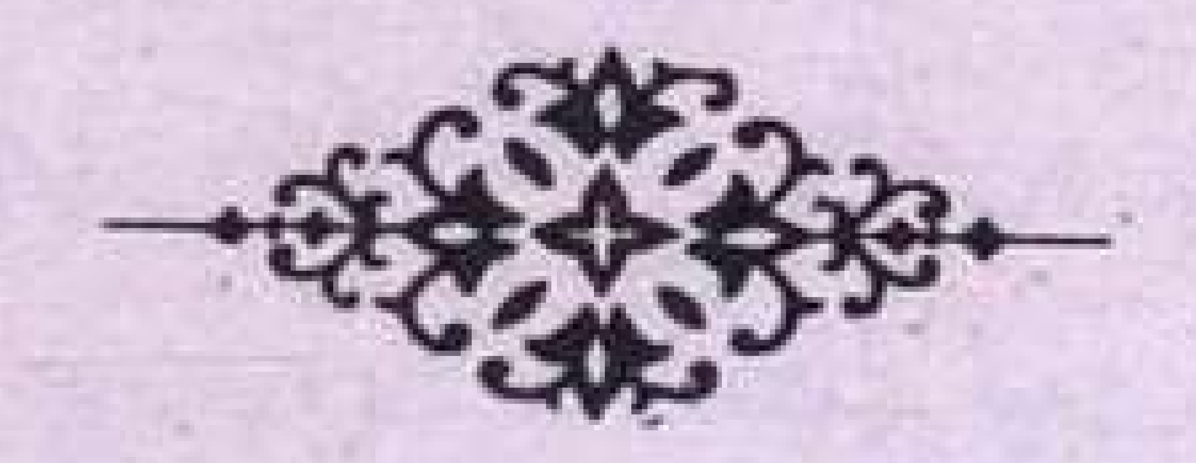
حُسنِ انداز بیاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ
توانسار و اصفہاں، مجھ میں نہ ڈھونڈ

یوں تو ہندی بھی ہے پیاری پارسی
اس سے پیاری ہے زبان فارسی

فارسی میں فکر میری شعلہ دم
اس میں تخیلِ طور ہے میرا قلم

رفعت اندیشہ کی فطرت شناس
یہ زبانِ دل مجھے آئی ہے راس

گر ہے پینا، رنگِ مینا سے گزر
بادۂ مینا پہ رکھ اپنی نظر



(۲)

خودی اور تعیّنات وجود

پیکرِ ہستی میں ہے جانِ خودی ذرّہ ذرّہ زیرِ فرمانِ خودی
جب خودی نے پالیا اپنا شعور عالمِ پندار نے پایا ظہور
ذات میں اس کی ہے پوشیدہ تضاد غیرِ خود کا اس نے چکھا ہے سواد
اپنی ہستی کو سمجھ کر ذاتِ غیر اس نے اپنے آپ سے رکھا ہے بیر
خوش ہے پیکر سازیِ اغیار میں جس سے شدت لذتِ پیکار میں
وار اپنے آپ پر اس نے کیے اپنی قوت آزمانے کے لیے
خود فریبی کا ہے وہ تار و پو خون سے کرتی ہے، مثلِ گل، وضو
اک گلِ رشکِ گلستاں کے لیے وہ لہو صدہا گلستاں کا پیے
سیکڑوں آہ و بکا پیدا کرے تاکہ اک نادر نوا پیدا کرے
اک فلک، اور وہ بنائے سو ہلال ایک نکتہ اور کرے صد قیل و قال
اُس کا یہ اِسراف، یہ جنگ و قتال تاکہ ہو تخلیق و تکمیلِ جمال
حسنِ شیریں کا اٹھانے کو خمیر وہ بہاتی ہے ہزاروں جوئے شیر
نافۂ مشکیں کی خاطر، دمبدم آہوؤں کے چاک کرتی ہے شکم
سوزِ پیہم سے جو ہے پروانہ خوش شمع سے کہتی ہے۔ بن پروانہ کُش
نقشِ امروز اس نے کتنے رد کیے ایک روشن صبحِ فردا کے لیے

سو خلیلوں کو دیا ہے اس نے داغ
تاکہ روشن ہو محمدؐ کا چراغ

بنتی ہے خود بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

کھینچتی کھنچتی، بھگاتی، بھاگتی
مارتی، مرتی، جگاتی، جاگتی

خود ہی قاتل اور خود مقتول ہے
خود ہی رسوا اور خود مقبول ہے

اس کا میدانِ عمل ہے کائنات
وہ اگر جاگے تو دن، سوئے تو رات

ہیں اسی کی رات میں گلکاریاں
ہے غبارِ راہ اس کا آسماں

اپنے شعلے کو شرر میں بانٹ کر
دی خرد کو صرف اجزا کی خبر

خود شکن ایسی کہ اجزا میں بٹی
اور پریشاں ہو کے صحرا بن گئی

منتشر جب تک تھی صحرا اور تھی
اور جب سمٹی تو پھر کہسار تھی

خود کو کرنا فاش ہے خوئے خودی
ذرّے میں قوت ہے از روئے خودی

ایک قوت جو ہے بیتابِ عمل
اور عمل بھی زیرِ اسبابِ عمل

○

زندگی میں چونکہ ہے زورِ خودی
ہے بقدرِ استواری، زندگی

قطرہ جب حرفِ خودی از بر کرے
ہستیٔ بے مایہ کو گوہر کرے

چونکہ مے ضعفِ خودی کا ہے شکار
جام سے لیتی ہے پیکر مستعار

گرچہ پیکر یافتہ ہے جامِ مے
اس کی گردش آدمی کے دم سے ہے

خود کو تج کر کوہ جب صحرا بنے
کیا حریفِ جوششِ دریا بنے!

موج جب تک خود کو رکھے برقرار
ہے وہ سینے پر سمندر کے سوار

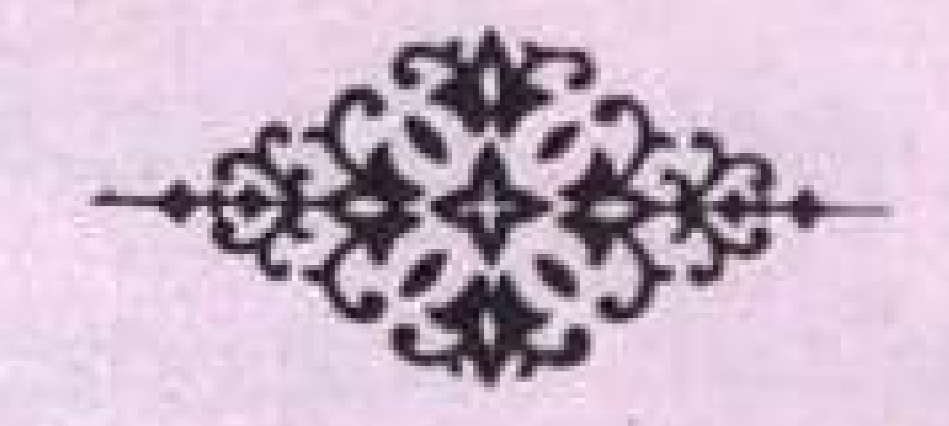
حلقہ زن ہو کر بنا جب "نور" آنکھ
دیکھنے پر ہو گئی مامور آنکھ

پہلے دیدِ جلوہ کی خواہش ملی
آنکھ کو پھر قوتِ جنبش ملی

جونہی آئی سبزے میں اُگنے کی تاب
تھا زمیں کو چیرنے میں کامیاب

شمع میں جب تک رہا زورِ خودی — وہ رہی خود اپنے پیروں پر کھڑی
جب پگھل کر دور خود سے ہو گئی — بن کے آنسو اپنی نظروں سے گری
پختگی ہوتی نگینے میں اگر — یوں نہ چھلتا اُس کا چھینی سے جگر
نام اُس پر غیر کا ہوتا نہ یوں — بوجھ نامِ غیر کا ڈھوتا نہ یوں
جا نہیں سکتا قوی تر کے خلاف — چاند ہے گردِ زمیں محوِ طواف
گھومتی ہے گردِ سورج کے زمیں — کیونکہ سورج سی وہ طاقتور نہیں
خیرہ کن ہے کس قدر شانِ چنار — جس سے دو بالا جلالِ کوہسار
آگ نے اس کا بُنا ہے تار و پود — تخمِ گردن کش سے ہے اس کا وجود

جب خودی حاصل کرے نیروئے زیست
پھیل کر قلزم نہ ہو کیوں جوئے زیست؟



۳

حیاتِ خودی اور تخلیقِ مقاصد

مدعا سے زندگی میں ہے بقا — کارواں کو، مدعا بانگِ درا
جستجو سے زندگی وابستہ ہے — آرزو سے زندگی پابستہ ہے
آرزو دل میں سدا رکھ برقرار — ورنہ بن جائے گا جیتے جی مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو — فطرتِ ہر شے امینِ آرزو
آرزو سے رقصِ دل سینے میں ہے — آرزو ہی سے مزہ جینے میں ہے
طاقتِ پرواز بخشے خاک کو — راستہ دکھلائے وہ ادراک کو
دل میں سوزِ آرزو سے ہے حیات — اور حیاتِ دل میں دنیا کی نجات
دل کرے جیسے ہی ترکِ آرزو — اس میں کچھ باقی نہ رہ جائے لہو
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — آرزو ہے موجِ دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد کی کمند — دفترِ اعمال کی شیرازہ بند
اُس سے دوری کیوں نہ مرگ آموز ہو — شعلہ بجھ جائے اگر کم سوز ہو
یہ جو اپنا دیدۂ بیدار ہے — آرزوئے لذتِ دیدار ہے
پاؤں بخشے مور کو رفتار نے — ناچنے کی خواہشِ بیدار نے
پہلے دل بلبل کا نغمہ زار تھا — شوقِ نغمہ خالقِ منقار تھا
نَے، نیستاں سے ہوئی پہلے جدا — بعد میں اس سے ہوئے نغمے جدا

عقلِ ندرت کوش کا ہے راز کیا
تو نے سمجھا بھی، یہ ہے اعجاز کیا

آرزو نے عقل کو پیدا کیا
آرزو ہے زیست کا روشن دیا

کیا ہے نظمِ قوم و آئین و رسوم؟
کیا ہے رازِ تازگیہائے علوم؟

آرزوئے خود شکن، مشعل بدست
جو حدودِ دل سے نکلے ہو کے مست

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش

آرزو ہی نے یہ سب پیدا کیے
جنگ میں اپنے تحفظ کے لیے

علم و فن کا، آگہی مقصد نہیں
آگہی کو فکرِ نیک و بد نہیں

علم و فن سامانِ حفظِ زندگی
علم و فن میں رازِ تقویمِ خودی

علم و فن سے ہے کشادِ زندگی
علم و فن ہیں خانہ زادِ زندگی

یوں نہ رازِ زندگی سے دور رہ
پی مئے مقصد، سدا مخمور رہ

ایسا مقصد جس کے راسخ رابطے
آگ ہے جو ماسوا کے واسطے

ایسا مقصد جو ہے رشکِ آسماں
دلربا، دلبر، دل آسا، دلستاں

رخ جو سیلابِ بلا کا موڑ دے
باطلِ دیرینہ کے بت توڑ دے

دیکھ تخلیقِ مقاصد کا اثر
اس سے ہم ہیں زندہ تر، پائندہ تر

**

۴

عشق اور استحکامِ خودی

نور کا نقطہ بنا ہم میں خودی
خاک ہم، وہ ہے شرارِ زندگی

عشق کے باعث خودی پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

عشق سے ہے اس کے جوہر میں حیات
اس کے دل میں ارتقائے ممکنات

عشق سے اس کی طبیعت میں ہے سوز
عشق ہی سے ہے خودی عالم فروز

عشق کو تیغ و سناں سے باک کیا!
آب و گِل سے وہ نہیں ہے پاک کیا؟

عشق اگر ہے صلح، تو پیکار بھی
آبِ حیواں بھی ہے وہ تلوار بھی

عشق کی نظروں سے پتھر بھی ہو شق
عشقِ حق ہے آخرش سرتاپا حق

عشق کر، اپنے لیے محبوب مانگ
چشمِ نوحؑ و فطرتِ ایوبؑ مانگ

ایک ایسا مردِ کامل ڈھونڈ لے
کیمیا جو تیری مٹی کو کرے

ڈوب جا یوں عشقِ طوفاں خیز میں
روم تھا جیسے غمِ تبریز میں

ہے ترا محبوب خود تجھ میں نہاں
آنکھ رکھتا ہو تو میں کر دوں عیاں

اس کے عاشق خوب سے بھی خوبتر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر

دل ہیں، اس کے عشق سے تاب و تواں
خاک اس کے عشق سے رشکِ جناں

عشق ہی کا فیض تھا کہ خاکِ نجد
پل میں پہنچی عرش پر، آیا جو وجد

قلبِ مسلم میں ہیں مقامِ مصطفیٰؐ
آبرو ہم سب کی نامِ مصطفیٰؐ

خاک اُس کی طور کا رکھے بھرم
اس کا گھر کعبے کا ہے بیت الحرم

ایک پل اس کا ازل سے تا ابد
کون ناپے اُس کی پہنائی کی حد

بوریے پر سوئے وہ عالی تبار
اُس کے پیرو تاجِ کسریٰ لیں اتار

جو حرا میں خلوتیِ راز تھا
ہاں وہی انساں حکومت ساز تھا

اُس کی آنکھیں رات میں محرومِ خواب
تاکہ برپا ہو جہاں میں انقلاب

تیغ اس کی جنگ میں آہن گداز
اور آنکھیں اس کی نم وقتِ نماز

ہر دعا پر کہتی "آمیں" اُس کی تیغ
قاطعِ نسلِ سلاطیں اُس کی تیغ

اک نیا آئین دنیا کو دیا
طرزِ اقوامِ کہن کو رد کیا

دین سے کر کے درِ دنیا کو باز
کر دیے وا ہم پہ اس دنیا کے راز

اس کا خود تاریخ دیتی ہے ثبوت
کب دیا دھرتی نے پھر ایسا سپوت

ایک تھے اس کی نظر میں خاص و عام
ساتھ دسترخوان پر ہوتے غلام

دخترِ طے[1] جنگ میں ہو کر اسیر
آئی جب پیشِ شہِ گردوں سریر

شرم سے تھا اس کا پیکر آب آب
پاؤں میں زنجیر اور رخ بے حجاب

جب نبیؐ نے دیکھی یہ بے پردگی
اپنی چادر اُس کے سر پر ڈال دی

آج اُس خاتون سے بے پردہ تر
ہم کھڑے ہیں پیشِ اقوامِ دگر

کیوں نہ ڈالے اپنی چادر ہم پہ آج
رکھنے والا ہے وہی محشر میں لاج

وجہِ رحمت اس کا لطف و قہر تھا
دوست دشمن سب کے حق میں مہر تھا

[2] اس گھڑی جب موقعِ تادیب تھا
اس کے لب پر قولِ "لاتثریب" تھا

---

[1] قبیلۂ طے کے سردار کی بیٹی۔

[2] فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم نے "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (آج تم سے کوئی باز پرس نہیں) کہہ کر اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا تھا۔ یہی الفاظ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو معاف کرتے وقت استعمال کیے تھے (دیکھیے سورۂ یوسف آیت ۹۲)

دین میں لے کر وطن سے ہم پناہ — ایک ہیں، جیسے دو آنکھیں اک نگاہ
ہم حجازی بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں — ہم میں ہندی اور خراسانی بھی ہیں
مستِ چشم ساقیِ بطحا[۱] ہیں ہم — متصل مثلِ مے و مینا ہیں ہم
امتیازات نسب سے پاک ہیں — کیونکہ ہم آتش زنِ خاشاک ہیں
ایک بو، والے گلِ صد رنگ ہم — ایک ہیں خوشیاں ہماری ایک غم
ہم کہ اس کے دل میں تھے سرِ نہاں — ایک نعرے میں ہوتے سب پر عیاں
اس کا شور عشق میری نے میں ہے — شورشِ فریاد میری لے میں ہے
ذکر اس کا کیوں نہ پھیلے مثلِ مشک — ہجر[۱] میں جس کے ہو گریاں چوبِ خشک
قلب ہر مسلم میں تابش اس سے ہے — طور پر عرفاں کی بارش اس سے ہے
آتشِ فرقت وہ اس کی، الاماں — کتنا تڑپاتا ہے وہ آرامِ جاں
میں گلستاں، وہ مرا ابرِ بہار — میں لبِ دریا، وہ دریا در کنار
منتیں کیں میں نے کتنی یار کی — تب ملی دولت مجھے دیدار کی
حسنِ یثرب پر ہے اک عالم نثار — وہ مرے محبوب کا ٹھہرا دیار
گرچہ فنِ شعر میں نامی ہوں میں — کشتۂ خوش گوئیِ جامی ہوں میں
شان میں جو اس کی جامی نے کہا — پیش کرتا ہوں وہ شعر بے بہا

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست"[۲]

۱؎ ستون حنانہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس لکڑی کے ستون سے آنحضرتؐ ٹیک لگا کر خطبہ فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہوا اور آپؐ خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف فرما ہوئے تو صحابہ نے اس ستون سے چیخ کر رونے کی آواز سنی اور یوں لگا جیسے یہ ستون حضورؐ کی جدائی میں رو رہا تھا۔ اسی سبب اس کا نام ستون حنانہ (نوحہ کناں ستون) پڑا۔ ۲؎ ترجمہ "آپؐ صحیفۂ کائنات کا دیباچہ ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

اسمِ اعظم سے نہیں کم اسمِ عشق — اتباعِ یار بھی از قسمِ عشق
لہ کاملِ بسطامؒ بھی کیا مرد تھا — اتباعِ یار میں جو فرد تھا
لہ کتنا سنت کا تھا اس کو احترام — کر لیا تھا خود پہ خربوزہ حرام
ہے اگر عاشق تو کر تقلیدِ یار — تاکہ اک دن بن سکے یزداں شکار
ہو مکیں دل کے حرا میں لمحہ بھر — ترکِ خود کر، سوئے حق کر جا سفر
حق سے مل کر لوٹ آ، خود میں سما — کر دے اصنامِ ہوس کا خاتمہ
لے چلے گا پھر تجھے سلطانِ عشق — جا کے دم لے گا سرِ فارانِ عشق

پھر بیاں ہونے لگیں گے تیرے گن
لہ قولِ ربانی ہے "اِنِّی جاعِلٌ"

**

(مسلسل) ساری دنیا آپؐ کی غلام اور آپؐ ان کے آقا ہیں"۔

لہ، لہ حضرت بایزید کی طرف اشارہ ہے جو شہر بسطام کے رہنے والے تھے اسی لیے بایزید بسطامی کے نام سے مشہور رہیں اور اقبال نے یہاں انہیں "کاملِ بسطام" کہا ہے۔ بایزید بسطامیؒ بڑے پایہ کے صوفی بزرگ تھے۔ انہیں آنحضرتؐ سے اس درجہ عشق تھا کہ ان کا ہر قول و فعل، آداب نشست و برخاست سنت کی مطابقت میں ہوتا۔ انہوں نے عمر بھر خربوزہ محض اس لیے نہیں کھایا کہ وہ یقین کے ساتھ نہیں جانتے تھے کہ حضورؐ یہ پھل کس طرح کھاتے تھے۔

لہ اِنِّی جاعِلٌ فی الاَرضِ خلیفۃ۔۔۔ (میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔۔) کی طرف اشارہ ہے۔

۵

خودی اور مفلسی

بن گیا تو شیر سے روبہ مزاج — اور سبب اس کا نہیں جز احتیاج

خستہ و بدحال کرتی ہے غرض — تجھ کو لاحق اور نہیں کوئی مرض

سست پڑ جاتی ہے اس سے فکرِ تند — قوتِ تخئیل ہو جاتی ہے کُند

رنگ اپنا اپنی محنت سے جما — اپنے ہاتھوں سے خود اپنا دھن کما

[1] خود اتر تو اونٹ سے مثلِ عمرؓ — غیر کے احساں سے سو بار الحذر

کب تلک منصب کی دریوزہ گری — اسپِ چوبیں کے لیے یہ طفلگی!

اپنی فطرت کو، جو ہے افلاک سیر — مت گرا تو لے کے یوں احسانِ غیر

ہاتھ پھیلانے سے ڈرتی ہے خودی — پارہ پارہ ہو کے مرتی ہے خودی

ہاتھ پھیلانے سے مفلس خوار تر — کر کے دریوزہ گری نادار تر

کر نہ یوں اپنی خودی کو پاش پاش — مثلِ مہ، رزق اپنا پہلو سے تراش

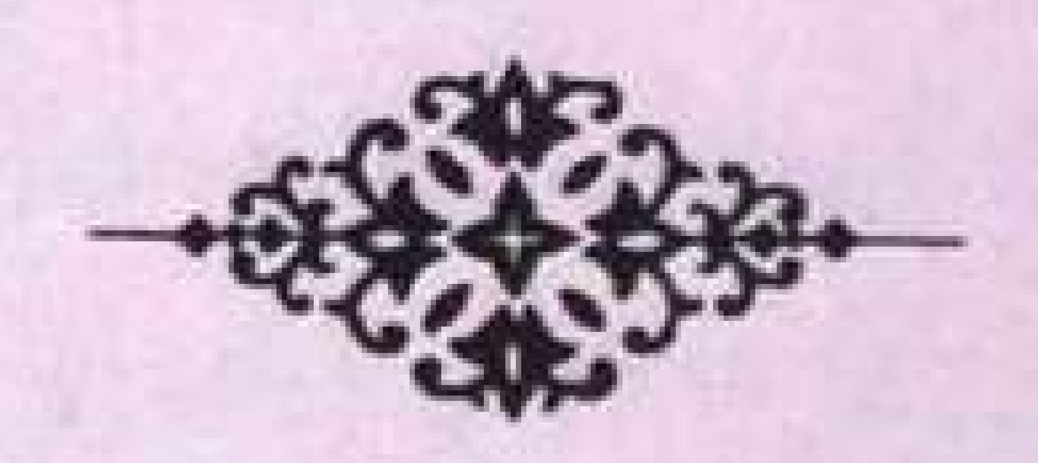
گرچہ تو ہو تنگ روزی، تنگ دست — بھیک سے فطرت کو اپنی کر نہ پست

---

[1] ایک مرتبہ اونٹ پر سواری کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے تازیانہ گر پڑا تھا، وہ امیر المومنین کی حیثیت سے کسی کو تازیانہ اٹھا کر دینے کا حکم دے سکتے تھے لیکن وہ خود ہی اونٹ سے اترے اور تازیانہ اٹھا کر اونٹ پر پھر سے سوار ہوئے۔ اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

اپنا رزق اوروں کے دسترخوان پر ڈھونڈ کر کیوں ہو رہا ہے خوار تر
پیشِ پیغمبرؐ مبادا ہو خجل روزِ محشر جو ہے کتنا جاں گسل
ہے جو سورج چاند کا روزی رساں چاند میں ہیں داغِ احساں کے نشاں
مانگ ہمت حق سے، لڑ گردوں سے تو ملتِ بیضا کی رکھ لے آبرو
قولِ پیغمبرؐ نہ بھول اے کم نصیب "مردِ محنت کش" ہے اللہ کا حبیب [1]
تُف ہے اس پر جو ہوا مرہونِ غیر اپنی خود داری سے جو رکھتا ہے بیر
حیف ہے اس پر جو اتراتا پھرے کوڑیوں کے مول عزت بیچ کے
آفریں اس پر ہے جو پیاسا مرے پر نہ غیروں سے طلب پانی کرے
ہاتھ پھیلا کر جو شرمندہ نہ ہو مر کے بھی وہ شخص کیوں زندہ نہ ہو
اے خوشا وہ نوجوانِ ارجمند جس کا سینہ ہے تنا اور سر بلند
جو تہی دستی میں ہے خود دار تر بختِ خفتہ رکھ کے بھی بیدار تر
بھیک کے ٹکڑوں میں ہے پوشیدہ آگ تجھ میں ہو غیرت تو اس سے دور بھاگ
اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے اگر قطرۂ شبنم بھی ہوتا ہے گہر

قائم اپنی غیرتِ مردانہ رکھ
تو حباب آسا نگوں پیمانہ رکھ



۱؎ حدیث کے الفاظ ہیں الکاسب حبیب اللہ (اپنی محنت سے روزی کمانے والے کو اللہ پسند فرماتا ہے)۔

۶

عشق، خودی اور تسخیرِ نظامِ عالم

عشق سے ہوتی ہے جب محکم خودی — بنتی ہے فرماں دہِ عالم خودی

ہیں خودی کے غنچہ ہائے ضوفشاں — جن سے قدرت نے سجایا آسماں

ہاتھ اس کا ہاتھ ہے اللہ کا — چیر دے انگلی سے سینہ ماہ کا

اختلافاتِ جہاں میں وہ حکم — زیر فرماں اس کے ہیں دارا و جم

اب سنو مجھ سے حدیثِ بوعلیؒ[1] — جو تھے ملکِ ہند کے نامی ولی

چھیڑ[2] کر باغِ کہن کی داستاں — وہ گلِ رعنا کا کرتے تھے بیاں

ہے[3] زمیں کا خطۂ آتش نژاد — ان کا دامن تھام کر مینو سواد

ایک دن بازار کو بہر خرید — جا رہا تھا بوعلی کا اک مرید

شہر کا عاملِ بھی آتا تھا سوار — ساتھ تھے اس کے غلام و چوبدار

اک نقیب اس کا لگاتا تھا صدا — اس نگر کا سن لے ہر چھوٹا بڑا

---

[1] بوعلی قلندر۔ ان کا نام شرف الدین قلندر تھا۔ پانی پت کے مشہور ولی۔ پانی پت ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔ [2] حضرت بوعلی کی مثنوی "کنز الاسرار" کے اس نعتیہ شعر کی طرف اشارہ

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن — از گلِ رعنا بگو با ما سخن

(اے باغِ کہن سے آئے ہوئے بلبل خوش آمدید، تو ہمیں اس باغ کے گلِ رعنا کے بارے میں کچھ سنا)

"باغِ کہن" سے اسلام اور گلِ رعنا سے آنحضرتؐ مراد ہیں۔ [3] اشارہ پانی پت کی طرف جہاں سخت گرمی پڑتی ہے۔

حکم ہے یہ حاکمِ ذیجاہ کا راستہ رکھیو سواری کا کھلا
راہ میں لیکن وہ درویشِ خدا تھا کھڑا افکار میں ڈوبا ہوا
جب یہ دیکھا کہ نہیں ہٹتا فقیر تاؤ میں آیا نقیب بے ضمیر
اتنا غصہ تھا کہ تھرانے لگا لاٹھی بے چارے پہ برسانے لگا
وہ فقیر خستہ کرتا آہ آہ جیسے تیسے آیا نزد خانقاہ
بو علیؒ سے اس نے پھر فریاد کی کی شکایت اس ستم ایجاد کی
سُن کے یہ، حالت عجب تھی شیخ کی جیسے بجلی کوہ پر ہو آگری
شیخ کو اس طرح آیا تھا جلال جیسے ساحل دے سمندر کو اچھال
اس قدر غصے سے بے قابو ہوئے اپنے منشی سے یہ فرمانے لگے
تم ابھی سلطان کو فرماں لکھو اس کو مردِ جاہل و ناداں لکھو
اس کو جانب سے ہماری یہ کہو تیرے عامل نے ہمارے دوست کو
کیوں سرِ بازار یوں رسوا کیا تو نہیں دے گا اگر اس کو سزا
سن ہمارا فیصلہ اے تیرہ بخت اور کو دے دیں گے تیرا تاج و تخت
شاہ نے جس وقت یہ فرماں پڑھا بید کے مانند تھرّانے لگا
اس نے عاملِ کو کیا زنجیر پا عفو نامہ پھر قلندر کو لکھا
میر خسروؔ شاعرِ رنگیں بیاں مطرب آتش نوا، شیریں زباں
جن کو سلطاں نے بنایا تھا سفیر عفو نامہ لے کے پہنچے نزد پیر
پھر غزل پیشِ قلندر چھیڑ کر وہ سماں باندھا کہ تھا جادو اثر
نغمۂ خسروؔ میں تھا ایسا کمال پڑ گیا ٹھنڈا قلندر کا جلال
جو نہ تھا کم سختیٔ کہسار سے وہ پسیجا نغمۂ گفتار سے

تو فقیروں کی دل آزاری نہ کر
آگ میں گرنے کی تیاری نہ کر

۷

نفیِ خودی - غلامی کا فلسفہ

تھی کہیں پر اک چراگاہِ قدیم — تھیں جہاں بھیڑیں فراغت سے مقیم
نسل افزا تھا بہت وہ سبزہ زار — پل رہی تھیں جس میں بھیڑیں بے شمار
کوئی کھٹکا تھا، نہ خطرہ تھا، نہ ڈر — زندگی آرام سے کرتیں بسر
اُن کی بدبختی کہ اک شب ناگہاں — آگری ان پر بلائے آسماں
دھاڑتے آئے وہاں جنگل کے شیر — کرلیا اک آن میں بھیڑوں کو زیر
شیر کی فطرت ہی ہوتی ہے شکار — خون سے تھا لال سارا مرغزار
پھر ہوا اعلان بعد قتل عام — آج سے بھیڑیں ہماری ہیں غلام
حکمرانی طاقت وصولت کا نام — حکمرانی قوت و شوکت کا کام
گرگِ باراں دیدہ تھا اک گوسفند — فتنہ زا، چالاک، زیرک، ہوشمند
سوچتا تھا کب تلک ماتم کریں — کیوں نہ سامان تحفظ ہم کریں
کس طرح ہو ناتوانی کا علاج — شیر اگر ہیں سنگ تو بھیڑیں زجاج
سچ تو یہ ہے شیر کا بچہ بھی شیر — گوسفندوں سے نہ ہو پائیں گے زیر
ہے کہاں دنیا میں ایسی کیمیا — جس سے بھیڑوں کو بنائیں بھیڑیا؟
ایک ہی بس ہے علاج درد و غم — گوسفندی شیر کو سکھلائیں ہم
جب غلاموں میں نہ ہو زورِ ستیز — ہوتے ہیں تدبیر سازی میں وہ تیز

ان کے اعضائے عمل ہوتے ہیں سُن
ان میں چالاکی کے آجاتے ہیں گُن

دل میں پلتا ہے جنونِ انتقام
فتنہ پرور ہوتی ہے عقلِ غلام

بن گیا واعظ وہ دانا گوسفند
اور پھر اس نے کیا آغازِ پند

ہو کے شیروں سے مخاطب یہ کہا
"اے درندو! ہوش کی کھاؤ دوا

تم ہو وحشی اور خوں آشام ہو
قتل و غارت میں بہت بدنام ہو

میں ہوں تم شیروں کا روحانی امام
چھوڑ دو سارے برائی کے یہ کام"

پھر کہا "اے قوم کذابٌ اَشِر[1]
تم نہ بھولو یَومَ نَحسٍ مُّستَمِر[2]

زور و طاقت ہو تو آتا ہے غرور
ہے یہ سارا گوشت خوری کا قصور

صرف سبزی پر کرو تم اکتفا
درحقیقت یہ ہے روحانی غذا

ترک کر کے زور و طاقت کا شعار
کیوں نہ رہبانی کرو تم اختیار

شخصِ تُند و زور آور ہے شقی
ہے نہاں ترکِ خودی میں زندگی

تیز دندانی سے ہو رسوائے دہر
کھا نہ جائے تم کو یہ اپنا ہی زہر

ناتوانوں کا ہے جنت میں مقام
زور و طاقت میں خرابی ہے تمام

جستجوئے عظمت و شوکت ہے شر
تم غریبی میں کرو اپنی بسر

تاک میں دانے کی بجلی ہے کہاں؟
دانہ گر خرمن بنے تو ہے زیاں

تم سمٹ کر دشت سے ذرہ بنو
تاکہ سورج کی چمک سے جی اٹھو

---

[1]، [2] کَذّابٌ اَشِر (جھوٹا اور خود پسند) یہ الفاظ قوم ثمود نے اپنے پیغمبر حضرت صالح ؑ کے لیے استعمال کیے تھے اور یَومِ نَحسٍ مُّستَمِر (ایک منحوس دن) وہ الفاظ ہیں جو قرآن میں قوم عاد پر عذاب نازل کرنے سے متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ پوری آیت یہ ہے اِنّا اَرسَلنا عَلَیہِم رِیحاً صَرصَراً فی یَومِ نَحسٍ مُّستَمِر (ہم نے ان پر (یعنی قوم عاد پر) ایک منحوس دن تیز و تند آندھی بھیجی) (سورۂ قمر آیت ۱۹)، گوسفند یہ قرآنی الفاظ استعمال کر کے شیروں کو ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے اس کی بدنیتی اور مکاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

کیوں ہو نازاں ذبح کر کے گوسفند — نفس کو مارو کہ ہے کارِ بلند
زندگی کو کرتے ہیں ناپائیدار — جبر و قہر و انتقام و اقتدار
سبزۂ پامال اُگ کر بار بار — کہہ رہا ہے جاوداں ہے خاکسار
بے خودی کا نام ہے فرزانگی — پاسداریِ خودی ، دیوانگی
چشم و گوش و لب رکھو ہر وقت بند — تاکہ گردوں سیر ہو فکرِ بلند
یہ علف زارِ جہاں ہے اک سراب — تم کرو ہر وقت اس سے اجتناب"
شیر جو پہلے سے اب کم کوش تھے — پندِ واعظ سنتے ہی مدہوش تھے
چل گیا دل پر فسونِ گوسفند — ان کو آیا پندِ خواب آور پسند
گوسفندوں کا جو کرتے تھے شکار — کی انہوں نے گوسفندی اختیار
اب وہ خوش ہو ہو کے کھاتے تھے علف — رفتہ رفتہ ہو گئی شیری تلف
اُن کے دانتوں میں صلابت اب نہ تھی — شعلہ بار آنکھوں میں ہیبت اب نہ تھی
جیسے اک سرباز کا سر اُڑ گیا — آئینے سے اس کا جوہر اُڑ گیا
کوششِ پیہم پہ اب مائل نہ تھا — جس میں ہو ذوقِ عمل وہ دل نہ تھا
عزم تھا باقی، نہ استقلال تھا — ساکھ تھی باقی، نہ وہ اقبال تھا
آہنیں پنجوں میں اب وہ دم نہ تھا — جس کا شیروں کو ذرا بھی غم نہ تھا
تن ہوا کمزور، ضعفِ جاں بڑھا — زندگی میں موت کا ارماں بڑھا
سو خرابی لائے اک کم ہمتی — کوتہ دستی، بیدلی، دوں فطرتی
خوابِ درویشی میں ایسا کھو گیا — شیر تھا بیدار لیکن سو گیا

سچ جو پوچھو جادوئے میشی ہے یہ
شیر کہتا ہے کہ درویشی ہے یہ

۸

فکرِ افلاطون

راہبِ دیرینہ، افلاطوں حکیم
سر گروہِ گوسفندانِ قدیم

قلزمِ[1] معقول میں اس کا جہاز
ساحلِ[2] محسوس سے تھا بے نیاز

عشقِ[3] نامحسوس میں گم کر کے ہوش
کر نہ پایا اعتبارِ چشم و گوش

اس کی رو سے موت میں ہے زندگی
شمع مردہ میں چھپی ہے روشنی

اک جہاں گاتا رہا ہے اس کے گن
گو پلاتا تھا مئے افسردہ کن

تھا لباسِ آدمی میں گوسفند
بھا گئے صوفی کو اس کے وعظ و پند

اس کی نظروں میں کہ تھیں افلاک پر
عالمِ اسباب تھا نامعتبر

منتشر کر کے وہ اسبابِ حیات
چاہتا تھا کھولنا بابِ حیات

اس کی نظروں میں زیاں بھی سود تھا
اس کی رو سے بود بھی نابود تھا

چشمِ بینا کے لیے بُنتا تھا خواب
وہ سمندر کا بناتا تھا سراب

اس قدر وارفتۂ معدوم تھا
وہ عمل کے ذوق سے محروم تھا

---

[1] معقول۔ وہ علم جو عقل کے توسط سے حاصل ہو [2] محسوس۔ حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والا علم۔ افلاطون حواس خمسہ کے علم کو غیر معتبر سمجھتا تھا کیونکہ اس کے نظریئے کے مطابق مادی دنیا کا کوئی حقیقی وجود نہیں بلکہ یہ عینِ مطلق کی نقل ہے [3] نامحسوس مراد خیالی وجود۔

منکرِ ہنگامۂ موجود، وہ | خالقِ اعیانِ[1] نامشہود وہ

زندہ دل کو عالمِ امکاں بہت | مردہ دل کو عالمِ اعیاں بہت

اُس کے آہو میں نہ تھا لطفِ خرام | لذتِ رفتار تھی اس پر حرام

اُس کی شبنم ذوقِ رم سے بے خبر | اس کا طائر تھا شکستہ بال و پر

تخم میں اس کے نہ تھا ذوقِ نمو | وہ تھا اک پروانہ ناشمع جو

زندگی میں دیکھ کر شورِ نشور | راہبِ بے چارہ تھا دنیا سے دور

اس نے جو دنیا بنائی پست تھی | نشۂ افیوں سے گویا مست تھی

سوئے گردوں گرچہ اڑ کر جا سکا | پھر نہ واپس آشیاں میں آسکا

اس کی مے افلاک میں کرتی ہے گم | میں نہ جانوں دُرد ہے یا خشتِ خم

اس کے نشّے سے ہوئیں قومیں خراب
ہوگئیں محرومِ ذوقِ انقلاب

---

[1] اعیان۔ عین کی جمع، یہاں عین کے معنی ہیں کسی مادہ شے کا مخصوص تصور یا خیال جسے انگریزی میں آئیڈیا (IDEA) کہتے ہیں، چونکہ اعیان نظر نہیں آسکتے اس لیے انہیں نامشہود (دکھائی نہ دینے والے) کہا گیا ہے۔ فلسفۂ افلاطون کی رو سے "عین" یا کسی شے کا مخصوص تصور ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس تصور سے متعلقہ مادی شے حقیقی نہیں بلکہ صرف اعتباری وجود رکھتی ہے مثلاً "گھر" کا مخصوص تصور انسانی ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے اور جس گھر کو ہم دیکھتے، یا اس میں رہتے ہیں وہ گھر کے "عین" کی محض نقل ہے۔ افلاطون کی نظر میں خدا عینِ مطلق ہے اور یہ کائنات اس کا عکس یا نقل ہے۔ افلاطون کے اسی نظریہ عینیت نے عجمی تصوف کے لیے راہ ہموار کی اسی لیے اقبال نے افلاطون کے نظریۂ عینیت کی شدید مذمت کی ہے

۹

حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ

دل کو گرمائے جو داغِ آرزو
نور برسائے چراغِ آرزو

آرزو سے زندگی آتش بجام
تیز فکر و تیز فہم و تیز گام

زندگی کا ماحصل تسخیر ہے
آرزو اس خواب کی تعبیر ہے

ہے شکاری زندگی، دام آرزو
حسن کو ہے دل کا پیغام آرزو

سن لے رازِ آرزو تے دمبدم
جس سے پیدا زندگی میں زیر و بم

جو بھی شے ہے دلفریب و دلنشیں
اس کو پائے گا تمنا آفریں

نقشِ زیبا جب تلک ہے روبرو
اس سے پیدا آرزو در آرزو

حُسن، خلاقِ بہارِ آرزو
حُسن ہے پروردگارِ آرزو

سینۂ شاعر، تجلی زارِ حسن
اُس کی ہستی مطلعِ انوارِ حسن

خوب کو شاعر بنادے خوب تر
اس کے جادو سے جہاں محبوب تر

نغمۂ بلبل میں ہے اس کا نکھار
اس کا غازہ، حسن افزائے بہار

سوز شاعر ہے دلِ پروانہ میں
نعرۂ حق وہ دلِ دیوانہ میں

قصۂ دل میں ہے وہ حسنِ بیاں
اصل قصے میں مزہ ایسا کہاں!

ہستی شاعر میں ہیں سو بحر و بر
اس کے دل میں سو جہانِ تازہ تر

اَن کھِلے پھولوں کی ہے اس میں بہار
اَن سُنے نالوں کا وہ ہے نغمہ زار

ماہ و انجم کا ہے شاعر ہم نشیں
زشت سے نا آشنا، خوب آفریں

قلب شاعر حاملِ آبِ حیات
اس کے اشکوں میں مئے نابِ حیات

راہ میں جب بھی بھٹک جاتے ہیں ہم
چلتے چلتے جب بھی تھک جاتے ہیں ہم

مثلِ بلبل گا کے بہلاتا ہے وہ
ہم کو منزل کی طرف لاتا ہے وہ

تاکہ ہم پا جائیں فردوسِ حیات
حلقۂ کامل بنے قوسِ حیات

کاروانوں کے لیے بانگِ درا
پیچھے پیچھے ہم، تو آگے وہ صدا

وہ ہمارے باغ کی بادِ نسیم
لالہ و گل میں چلے مثلِ شمیم

اُس کے جادو سے خود افزا زندگی
محتسبِ خودکی، خود آرا زندگی

اس کا دسترخوان ہے سب کے لیے
آگ سے اپنی جلاتا ہے دیے

○

اُف وہ قومیں جو کریں مرنے کی بات
جن کے شاعر میں نہیں ذوقِ حیات

حیف کہ وہ شاعرِ جادو نوا
زہر دیتا ہے ہمیں کہہ کر دوا

آئینے میں زشت کو دکھلائے خوب
ہے طلوعِ مہر میں اس کا غروب

پھول کو چومے تو ہو پژمردہ پھول
گائے تو بلبل بھی اڑنا جائے بھول

اس کی افیوں سے ترے اعصاب شل
بن کے وہ رنگیں بیاں کرتا ہے چھل

سرو پر چھائی ہے اس سے بے کسی
اس نے شاہیں کو سکھائی کرگسی

ماہیِ آدم نما، اک جل پری
بھولی بھالی شکل والی، چھل بھری

کیا بتاؤں کیا ہے اس کی شاعری
ساحری کے نام پر ہے قاہری

وہ اگر گائے تو سوئے ناخدا،
اپنی کشتی کو ڈبوئے ناخدا

اُس کے نغمے چھین لیں دل کا ثبات
اُس کا جادو موت کو بولے حیات

لوٹ لیتا ہے وہ اپنی تان سے — اُس پہ جو ریجھے وہ جائے جان سے

بے کسی کو ڈھال کر بہبود میں — وہ بدلتا ہے زیاں کو سود میں

وسوسوں میں جھونک دیتا ہے تجھے — اور عمل سے روک لیتا ہے تجھے

ہو کلام اس کا اگر برجستہ تر — وہ کرے خستہ دلوں کو خستہ تر

وہ سکھاتا ہے فقط مرنے کا فن — ہے سرابِ رنگ و بو اس کا چمن

اس کے نیساں میں نہیں بجلی کی لہر — اور اگر ہو بھی تو بن جاتی ہے قہر

حسن ہے اس کا صداقت سے بری — جیسے ہو جادو کی کوئی طشتری

خواب کا متوالا کہتا ہے نہ جاگ — پھونک کر، دل کی بجھا دیتا ہے آگ

پڑ نہ بلبل کی صدا کے پھیر میں — سانپ سویا ہے گلوں کے ڈھیر میں

الحذر اس شاعری سے الحذر
نقشِ جام و رنگِ مینا سے گزر

○

تجھ کو گھن آتی تھی جس کے نام سے — صبح کرتا ہے اُسی کے جام سے

چھین لیتا ہے یہ نغمہ تیرے ہوش — زہر قاتل پی نہ یوں از راہِ گوش

ساز میں تیرے یہ نغموں کی کمی، — ہے دلیلِ بیدلی و بیدمی

کتنا مانوسِ تن آسانی ہے تو — دہر میں ننگِ مسلمانی ہے تو

جب چلے تیری کمر میں بل پڑے — نازک اتنا کہ ہوا تجھ کو گڑے

گو تری فریاد طوفاں خیز ہے — عشق یہ تیرا ہوس انگیز ہے

عارضِ شاعر میں ہے زردی تری — اس کو ٹھنڈا کر گئی سردی تری

وہ تری خستہ دلی سے خستہ جاں — ناتوانی سے تری وہ ناتواں

اشکِ طفلانہ سے پُر ہیں اس کے جام — پُر ہے آہوں کے دھوئیں سے اس کی شام

مانگ کے پیتا ہے وہ میخوار سے — جھانکتا ہے روزنِ دیوار سے
پاشکستہ، سربرہنہ، سرگراں — ٹھوکریں درباں کی کھا کر نیم جاں
سوکھ کر کانٹا ہوا اُس کا بدن — ہے لبوں پر شکوۂ چرخِ کہن
کینہ توزی اور خوشامد میں ہے طاق — ضعف کا اس کے اڑاتے ہیں مذاق
تیرہ بخت و زیردست و دوں نہاد — ناسزا و ناامید و نامراد
اس کے نالوں سے تو بے مایہ ہوا — نیند سے محروم ہمسایہ ہوا

کیا مزہ اب عشق کے افسانے میں
مر گیا اِبن حرم بُت خانے میں

○

جیب میں نقدِ سخن ہر گز نہ رکھ — زندگانی کی کسوٹی پر پرکھ
فکر روشن ہے عمل کی راہبر — جس طرح بادل کی ہو بجلی نظر
مڑ کے تو دیکھے اگر سوئے عرب — فکر صالح سے رچے تیرا ادب
تو جو "سلمائے عرب"[1] پر ہو فدا — وہ اگر بن جائے تیری دلربا
پھر تو، کر سکتا ہے، از روئے نیاز — پیدا[2] شامِ کرد سے صبحِ حجاز
تو نے دیکھے ہیں عجم کے لالہ زار — تو نے لوٹی ہند و ایراں کی بہار

---

[1] سلمائے عرب۔ ادبیات عرب میں سلمیٰ ایک فرضی اور مثالی محبوبہ ہے۔

[2] شیخ حسام الحق ضیاء الدین کے مقولہ اَمسَیتُ کُردِیًّا اَصبَحتُ عَرَبِیًّا (شام کو میں کُردی ہوتا ہوں اور صبح حجاز میں) اقبال کی مراد یہ ہے کہ سلمائے عرب کو مثالی محبوبہ بنانے سے اہل اسلام میں وہ روحانی قوت پیدا ہو گی جو امتیاز عجم و عرب کو مٹا دے گی۔ کردیں شام اور حجاز میں صبح گزارنے سے یہی مراد ہے۔

آ قدم اب وادیِ صحرا میں رکھ — بادۂ دیرینۂ خرما بھی چکھ

ریت پر صحرا کی چلنا اور ہے — بادِ صرصر میں مچلنا اور ہے

تو نے ریشم کے بہت پہنے لباس — دیکھ لے یہ بھی ہے کیا عربی کپاس

تو بساطِ لالہ پر سویا بہت — مثلِ گُل شبنم سے منہ دھویا بہت

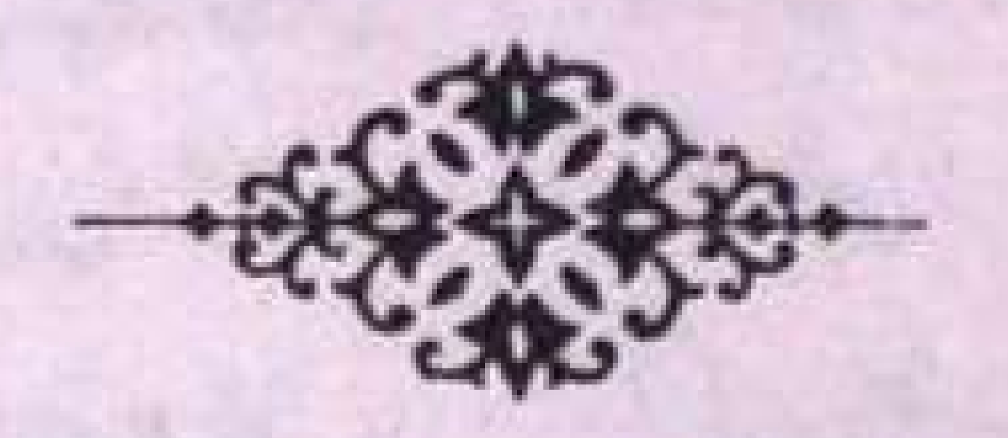
چکھ لے ریگِ گرم کا بھی کچھ مزا — چشمۂ زمزم میں بھی غوطے لگا

مثلِ بلبل چہچہانا کب تلک! — شاخِ گل پر آشیانہ کب تلک

رشکِ شاہیں! تیری منزل آسماں — کوہ پر اپنا بنا لے آشیاں

جو ہو شاہیں کے نشیمن سے بلند — برق پھینکے جس پہ رہ رہ کر کمند

تاکہ تو ہو اہلِ پیکارِ حیات
جسم و جاں میں ہو ترے نارِ حیات



۱۰

مراحلِ تربیتِ خودی

(۱) مرحلۂ اول — اطاعت

خدمت و محنت شتر کا ہے شعار
ہے قناعت اس کی عالم آشکار

طے خموشی سے کرے راہِ دراز
اس کو سب کہتے ہیں "صحرا کا جہاز"

کم خور، و کم خواب، و محنت آشنا
نقشِ پا اس کا ہے دقّت آشنا

مست، زیرِ بارِ محمل ہے رواں
خوش خراماں سوئے منزل ہے رواں

کتنا خوش خوش ہے دواں مستانہ وار
خوش نہ ہوگا اتنا خود اُس کا سوار

تو بھی محنت کر کہ دینا ہے حساب
کر ریاضت [1] عِندَہٗ حُسنُ المآب

کر اطاعت تو بھی اے غفلت شعار
جبر سے ہوتا ہے پیدا اختیار

سر بزیری میں چھپی ہے سروری
آگ کو ایندھن بنائے سرکشی

خود کو جو پابستۂ آئیں کرے
کیوں نہ تسخیرِ مہ و پرویں کرے

گل سے وابستہ صبا خوشبو بنے
بند خوشبو نافۂ آہو بنے

کیوں نہ تارے "گھر" سے نکلیں گھر چلیں
وہ اگر آئینِ فطرت پر چلیں

سبزہ، آئینِ نمو کا ہے کمال
ترکِ آئیں سے ہوا وہ پائمال

---

[1] عِندَہٗ حُسنُ المآب - قرآنی آیت کا ٹکڑا جس کے معنی ہیں خدا کے پاس بہترین ٹھکانہ یا انجام ہے۔

آگ میں جلنا گلِ لالہ کا کام ‏ ‏ ہے یہی آئیں کہ ہو آتش بجام
قطرے کو دریا کرے آئینِ وصل ‏ ‏ ذرے کو صحرا کرے آئین وصل
جب تلک آئین کی ہو پیروی ‏ ‏ کیوں نہ پھر ہر شے کا باطن ہو قوی
پھر ہے، اے آزادِ دستورِ قدیم ‏ ‏ چل اسی پر جو ہے راہ مستقیم
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں نہ بن
طاعت احمدؐ کا نکتہ چیں نہ بن

(ب) مرحلہ دوم — ضبطِ نفس

نفسِ امارہ میں ہے خود پروری ‏ ‏ خود پرستی، خود نمائی خودسری
ہاتھ میں رکھ نفس کی اپنے لگام ‏ ‏ مرد بننا ہے تو کر اس کو غلام
حکمراں خود پر نہیں کوئی اگر ‏ ‏ یہ سمجھ ہے زیر فرمانِ دگر
چاہ سے جس دم ہوئی تعمیرِ دل ‏ ‏ خوف بھی تھا شاملِ تقدیرِ دل
خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں ‏ ‏ خوفِ آلامِ زمین و آسماں
چاہ ملک و قوم کی، دولت کی چاہ ‏ ‏ چاہ خویشاوندکی، عزت کی چاہ
جب ہوا مٹی سے پانی کا ملاپ ‏ ‏ آگئی تن پروری اپنے ہی آپ
تن، تواہی کی طرف مائل ہوا ‏ ‏ خود تباہی کی طرف مائل ہوا
پر جو رکھے گا عصائے لاالہٰ ‏ ‏ خوف سے ہر وقت پائے گا پناہ
حق پرستی جس کے دل میں کم نہ ہو ‏ ‏ پیشِ باطل اس کی گردن خم نہ ہو
نام سے وہ خوف کے مرتا نہیں ‏ ‏ ماسوا سے وہ کبھی ڈرتا نہیں
ماسوا کی راہ جس نے بند کی ‏ ‏ چاہ کیا اس کو زن و فرزند کی
ماسوا سے جو کرے صرفِ نظر ‏ ‏ وہ چھری رکھے پسر کے حلق پر

ہو کے تنہا بھی وہ مثلِ فوج ہے — دَم کو کہتا ہے ہوا کی موج ہے

لا الٰہ مثلِ صدف، گوہر نماز — حج اصغر سے نہیں کمتر نماز

ہاتھ میں مسلم کے خنجر ہے نماز — قاتلِ فحشا[1] و منکر ہے نماز

مار کر روزہ بدن کی بھوک پیاس — عیشِ لافانی کی رکھتا ہے اساس

نسل و قومیت شکن ہوتا ہے حج — غالبِ حب الوطن ہوتا ہے حج

حج وہ طاعت، جو ہے جمعیت پسند — منتشر اوراق کی شیرازہ بند

حبِ دولت کو مٹاتی ہے زکوٰۃ — ایک سا سب کو بناتی ہے زکوٰۃ

دل کو "حتیٰ[2] تنفقوا" محکم کرے — حبِ کثرت کو نہایت کم کرے

ان کا مقصد، تجھ میں استحکام ہو — ہاں مگر پختہ ترا اسلام ہو!

چشمِ دل سے دیکھ کہہ کر "یا قوی[3]"
بندشِ تن میں نجاتِ اُخروی

۱؎ فحشا و منکر ۔ بے حیائی اور ناپسندیدہ بات ۔ اس شعر میں نماز سے متعلق اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے: ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاءِ والمنکر ولذکر اللہ اکبر ہ (بے شک نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ بات سے روکتی ہے ۔ اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے) سورۂ عنکبوت آیت ۴۵

۲؎ حتیٰ تنفقوا ۔ جب تک تم خرچ نہ کرو ۔ اس قرآنی آیت کی تلمیح جس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے زکوٰۃ، صدقات، خیرات دینے کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے: "لن تنالوا البرّ حتیٰ تنفقوا مما تحبون" (تم نیکی اس وقت تک نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب چیزیں (مراد مال دولت) اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو ۔

۳؎ اسم 'یا قوی' کا ورد

(ج) مرحلۂ سوم — نیابتِ الٰہی

اے شترباں! تو جہانبانی کرے
زیبِ سر، تاجِ سلیمانی کرے

رہتی دنیا تک جہاں آرا رہے
تاجدارِ ملکِ لا یبلیٰ[1] رہے

حکم فرمائے عناصر تو بنے
نائبِ حق بن کے ناصر تو بنے

نائبِ حق کیا بتاؤں کون ہے
مثلِ موسیٰ ہالکِ فرعون ہے

نائبِ حق روحِ عالم کی مثال
جس میں ظلِّ اسمِ اعظم کا جلال

رازِ جزو و کل سے ہے آگاہ وہ
دہر میں قائم بامر اللہ وہ

اِس جہاں میں جس گھڑی ہو خیمہ زن
پہلے وہ برہم کرے بزمِ کہن

اس کی فطرت میں ہے تخلیق و نمود
جس سے پاتے ہیں کئی عالم وجود

سَو جہاں اس کے تصوّر میں ملیں
پھول جیسے گلستانوں میں کھلیں

اس کو نفرت ہر خیالِ خام سے
پاک کعبے کو کرے اصنام سے

اُس کا جینا ہے اگر حق کے لیے
جان بھی دے قولِ برحق کے لیے

اس سے پیری میں بھی آہنگِ شباب
اس کا ہر شے پر چڑھے رنگِ شباب

وہ نذیرِ نوعِ انسان و بشیر
وہ سپاہی وہ مقنّن وہ امیر

مدعائے "علّم الاسماء"[2] ہے وہ
سِرِّ "سبحان الذی اسریٰ"[3] ہے وہ

---

[1] ملک لا یبلیٰ - وہ سلطنت جسے زوال نہ آئے۔ قرآن میں یہ فقرہ ابلیس کی طرف منسوب ہے۔ پوری آیت یوں ہے: "یا آدم ھل ادلک علیٰ شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ"۔ شیطان حضرت آدم کو پھسلانے کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتا ہے (آپ کو ہمیشہ رہنے والے درخت اور ایسی سلطنت کا پتہ دوں جو لازوال ہے؟)۔ [2] علّم الاسماء (ہم نے چیزوں کے نام سکھائے) سورۂ بقرہ (اگلے صفحہ پر)

وہ عصا رکھے، ید بیضا کے ساتھ
علم و قوت اس کے حق میں ایک بات

ہو عناں در دست جب وہ شہسوار
تیز تر دوڑے سمندِ روزگار

خشک کر دے اس کی ہیبت نیل کو
مصر سے لے جائے اسرائیل کو

اس کے "قُم" سے قبرِ تن میں مردہ جاں
اٹھ کھڑے ہوں جیسے سروِ گلستاں

ذات سے اس کی ہو توجیہہ جہاں
اور جلال اس کا نجات این و آں

اس کے سائے کا طلب گار آسماں
اُس کے دم سے مایہ ہستی گراں

جانفزا ہے اس کا اعجازِ عمل
وہ کرے تجدید اندازِ عمل

اس کے نقشِ پا پہ گل پھولیں پھلیں
سو کلیم اِس طور کی خاطر جلیں

زندگی کی اس سے ہو تفسیرِ نو
خواب کی کرتا ہے وہ تعبیرِ نو

نائبِ حق، واقفِ رازِ حیات
ناشنیدہ نغمۂ سازِ حیات

فطرت اک شاعر، وہ شعرِ بے بدل
ہے غزل دنیا تو وہ بیت الغزل

جب فلک رس ہو مرے دل کا غبار
اس سے نکلے کاش میرا شہسوار

آج میری خاک میں سویا ہے وہ
شعلۂ فردا مرا گویا ہے وہ

ہے مرا غنچہ چمن اندر چمن
میری آنکھیں صبح فردا میں مگن

اے سوارِ اسپِ دوراں! آ بھی جا
اے فروغِ چشمِ امکاں! آ بھی جا

(مسلسل) کی اس آیت کریمہ کی طرف تلمیح جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کائنات کا علم دے کر فرشتوں کے سامنے پیش کرنے کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ سبحان الذی اسریٰ - (پاک ہے وہ ذات جس نے رات میں چلایا)

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت مبارکہ جس میں اللہ تعالیٰ نے معراج نبی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ (حضرت محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکت دی ہے، لے گیا"۔ سبحان الذی اسریٰ سے اشارہ معراج کی طرف ہے۔

رونقِ ہنگامۂ ایجاد بن
پھر سے تسکینِ دلِ ناشاد بن

شورشِ اقوام کو خاموش کر
اپنے نغموں سے انہیں مدہوش کر

پھر اخوت کا سبق ان کو پڑھا
ان کی جانب ساغرِ الفت بڑھا

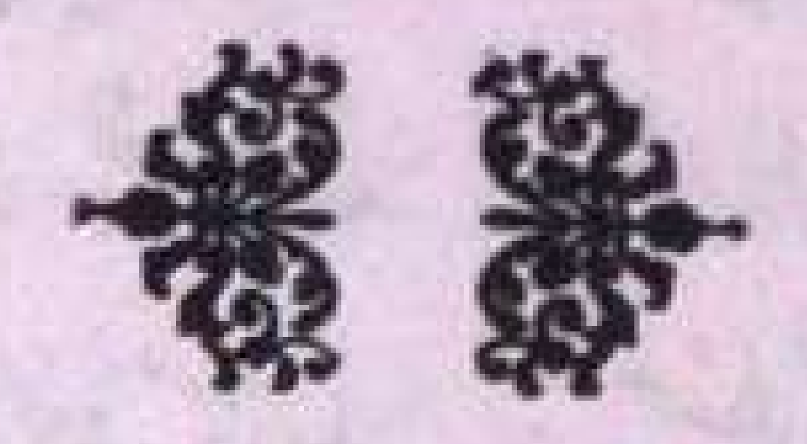
پھر سے اس عالم میں لا ایام صلح
جنگ بازوں کو سنا پیغام صلح

نوعِ انساں کا دھڑکتا دل ہے تو
کائنات شوق کا حاصل ہے تو

رُت ہے پت جھڑ کی، پڑا ہے جانِ بہار
آ بھی جا کہ تجھ سے ہے شانِ بہار

اپنے دیوانوں کی پھر اک اک جبیں
چوم لے کہ ان میں سجدے ہیں مکیں

یہ سمجھ کر تو کرے گا سرفراز
ہم اٹھاتے ہیں غم دنیا کے ناز



١١

اسرارِ اسمائے حضرت علیؓ

مسلمِ اول، شہِ مرداں علیؓ — عشق کا سرمایۂ ایماں علیؓ

وہ علیؓ، مشکل کشا، عالی تبار — خانداں سے جن کے میں رکھتا ہوں پیار

یہ اسی کا دیکھ روحانی اثر — دہر میں تابندہ ہوں مثلِ گہر

مثلِ نرگس، عاشقِ نظارہ، میں — مثلِ بو اس باغ میں آوارہ میں

مستِ زمزم ہوں انھیں کے نام سے — میں چھلکتا ہوں انھیں کے جام سے

خاک ہو کر بھی ہوں میں آئینہ وار — دیکھ لو میری نوا سینے کے پار

اُن کے رخ سے فال لیتے تھے رسولؐ — یاد ان کی دل پہ برساتی ہے پھول

قول ان کے، قوتِ دینِ مبیں — خانوادہ ان کا ہے حبلِ متیں

اُن کو کہتے تھے محمدؐ "بوتراب" — دستِ حق کا بھی ملا حق سے خطاب

جو ہیں دانائے رموزِ زندگی — جانتے ہیں سرِّ اسمائے علیؓ

ہم جسے کہتے ہیں 'تن' ہے آب و گل — عقل ہے اس کے تقاضوں پر خجل

فکرِ گردوں کو زمیں پر لائے "تن" — خس سے چشم و گوش کو بہلائے "تن"

ہاتھ میں تیغِ ہوس رکھتا ہے تن — رہروانِ شوق کا ہے راہزن

تن کی یہ مٹی کہ جو زنجیر ہے — شیرِ حق کے ہاتھ میں اکسیر ہے

فاتحِ تن بن کے لائے انقلاب — اس لیے کہتے ہیں ان کو بوتراب

ان کی شہرت ان کی کراری میں تھی — ان کی قوت ان کی خودداری میں تھی

حکم دے جب کوئی بن کر بوتراب — کیوں نہ پھر مغرب سے پلٹے آفتاب

جس کے مرکب پر کسا ہوتا ہے زین — ہے اسی کا یہ جہاں، یہ سرزمین

اس جہاں میں فاتحِ خیبر وہی
اُس جہاں میں ساقیِ کوثر وہی

خودشناسی سے یداللّٰہی ملی
جس کے ملنے پر شہنشاہی ملی

وہ کہ تھے دروازۂ شہرِ علوم
ان کے قدموں میں تھے مصر و چین و روم

جس کی مٹھی میں بدن کی خاک ہے
اس کا دل آلائشوں سے پاک ہے

جل کے بننا خاک، پروانے کا کام
خاک کا والی بنا، وہ نیک نام

بن تو پہلے سخت اے نازک بدن
گر ہے بننا سنگِ بنیادِ چمن

خود کی مٹی سے تو اک آدم بنا
اس کی خاطر پھر نیا عالم بنا

خاک سے اپنی بنا اپنا مکاں
ورنہ ہو جائے گی صرفِ دیگراں

میں نے مانا چرخ کے ہاتھوں ہے تنگ
کیوں ہے تو فریادیِ بیدادِ سنگ؟

نالہ و فریاد و ماتم تا بکے
سینہ کوبی ہائے پیہم، تا بکے

ہے عمل کے زور سے نورِ حیات
لذتِ تخلیق دستورِ حیات

اٹھ کہ تخلیقِ جہانِ تازہ ہو
قوتِ بازو کا بھی اندازہ ہو

ہو کے آتش پیرہن بن جا خلیل
کر بلند آوازۂ ربِ جلیل

ساز مت کر حالتِ ناساز سے
تیغ کیا اٹھے سپر انداز سے

ایسے خودداروں سے جو ہیں پختہ کار
ساز کر لیتا ہے خود ہی روزگار

اور زمانہ ہو اگر ناسازگار
اس سے لڑ جاتا ہے مردِ باوقار

وہ نظامِ کہنہ کی جڑ کاٹ کر
کرتا ہے تعمیر دنیائے دگر

گردشِ ایام سے لڑتا ہے وہ
صرف اپنی بات پر اَڑتا ہے وہ

اپنی قوت سے کرے وہ آشکار
اک نئی دنیا کہ، جو ہو سازگار

جی نہیں سکتا یہاں گر شان سے
مر تو سکتا ہے وہ لڑ کر شان سے

مشکلوں کا سامنا کر کے ہی شیر
جان سکتا ہے کہ ہے کتنا دلیر

کھیلتا ہے آگ سے مردِ جلیل
پھول چن لیتا ہے شعلوں سے خلیل

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار
ہیں فقط دشواریوں میں آشکار

پست ہمت کی نظر سوئے نشیب
بس اسی کا کام ہے مکر و فریب

زندگی ہے کوشش و ہمت کا نام
زندگی کو ذوقِ استیلا سے کام

عفو بینی کو دمِ خستہ سمجھ
غیر موزوں شعر کا سکتہ سمجھ

تجھ میں غیرت ہے تو ذلت سہہ نہ تو
ناتوانی کو 'قناعت' کہہ نہ تو

ناتوانی زندگی کی راہزن
بطن میں اس کے چھپے ہیں مکر و فن

اس کا سینہ خوبیوں سے ہے تہی
کہتی ہے، 'آماس' کو وہ فربہی

کیا عجب تجھ کو لگا لے بات میں
تیرا یہ دشمن ہے تیری گھات میں

ناتوانی کو سمجھنا ہے محال
اس کو ہے چہرہ بدلنے میں کمال

اہلِ دانش نے اسے سمجھا نہیں
اس کو اصلی روپ میں دیکھا نہیں

ہوشیار! اے مردِ دانا ہوشیار!!
نام اس کے 'رحم' 'نرمی' 'انکسار'

گاہ "مجبوری" کا وہ ڈالے نقاب
گاہ 'معذوری' کا وہ پائے خطاب

وہ بشکلِ "عیش سامانی" بھی ہے
ایک نام اس کا "تن آسانی" بھی ہے

صرف اظہارِ صداقت کے لیے
مردِ حق مرتا ہے، 'قوت' کے لیے

ہے یہ 'قوت' ہی جو شرحِ دل کرے
برملا فرقِ حق و باطل کرے

صاحبِ قوت اگر ہے مدعی
مانتے ہیں اس کی باتوں کو سبھی

اس سے باطل میں بھی آئے شانِ حق
بن کے 'حق' باطل کرے بطلان حق

زہر اس کے حکم سے کوثر بنے
خیر کو کہہ دے جو شر تو شر بنے

تیرے کندھوں پر امانت کا ہے بار
خود کو دو عالم سے بہتر کر شمار

ہے صفت تیری جو ظالم اور جہول
صرف غیر اللہ تک ہے، یہ نہ بھول

چشم و گوش و لب اگر رکھے نہ بند
ٹھوکریں کیوں کھائے مردِ ہوشمند

✽ ✽

(١٢)

حکایتِ سید مخدوم علی ہجویریؒ

سیدِ[1] ہجویرؒ، مخدومِ امم ۔۔۔ جن کا مرقد پیرِ سنجرؒ[2] کا حرم

توڑ کر رشتے کہستاں سے تمام ۔۔۔ ہند میں آیا وہ مردِ نیک نام

حق کی خاطر اُن کا وہ شوقِ جہاد ۔۔۔ تازہ کر دی عہدِ فاروقی کی یاد

پاسبانِ عزتِ قرآن تھے ۔۔۔ جتنے گھر باطل کے تھے، ویران تھے

بس گئے وہ اس طرح پنجاب میں ۔۔۔ ہو نشہ جیسے شرابِ ناب میں

قلب تھا اُن کا جو مایہ دارِ عشق ۔۔۔ ان کے رخ سے تھے عیاں اسرارِ عشق

بند کر کے اک کلی میں گلستاں ۔۔۔ اب سناتا ہوں میں ان کی داستاں

چھوڑ کر گھر اپنا اک مردِ خدا ۔۔۔ مرو سے لاہور میں وارد ہوا

آ کے پیشِ سیدِ والا جناب ۔۔۔ اس طرح اس نے کیا اُن سے خطاب

"دشمنوں سے میں گھرا ہوں اس طرح ۔۔۔ سنگ پاروں میں ہو شیشہ جس طرح

کس قدر جینا ہے مشکل کیا کہوں! ۔۔۔ دشمنوں کے بیچ میں کیسے رہوں؟"

پیرِ دانا نے کہا "اے خوش خصال ۔۔۔ کس لیے کہتا ہے جینا ہے محال

فکرِ دشمن سے تو ہو جا بے نیاز ۔۔۔ پھر سمجھ میں آئے گا جینے کا راز

---

[1] حضرت داتا گنج بخش سید مخدوم علی ہجویریؒ

[2] ان کے روضۂ مقدسہ پر پیر سنجر حضرت معین الدین چشتیؒ نے چلہ کشی کی تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

خود کو جب پتھر کرے شیشہ خیال — اس میں شیشے کی طرح پڑتا ہے بال

ناتواں خود کو جو سمجھے راہرو — ایک رہزن لوٹ لے گرچہ ہوں سَو

آب و گِل سمجھے گا خود کو تابکے — تیری گِل میں شعلۂ سینا بھی ہے

سرگراں کیوں ہے عزیزوں سے بتا — کس لیے کرتا ہے دشمن کا گلہ؟

سچ کہوں؟ دشمن بھی تیرا یار ہے — اس کے دم سے رونقِ بازار ہے

جانتا ہے جو مقاماتِ خودی — شکر کرتا ہے کہ دشمن ہے قوی

تیرا دشمن پیار کرتا ہے تجھے — خواب سے بیدار کرتا ہے تجھے

سنگِ رہ خاطر میں لائے مست کیا! — سیل کے آگے بلند و پست کیا!

عزم ہو تو سنگ رہ بھی ہے فساں — تیز رکھتی ہے جو خنجر کی زباں

کھا کے حیواں کی طرح سونا بھی کیا! — تو نہیں محکم تو "یہ ہونا" بھی کیا!

جب خودی سے خود کو تو محکم کرے — چاہے تو بزمِ جہاں برہم کرے

گر فنا چاہے تو ہو آزادِ خود — گر بقا چاہے تو ہو آبادِ خود

موت کو سمجھا فراقِ جان و تن! — موت تو ترکِ خودی ہے جانِ من!!

کر خودی میں صورتِ یوسفؑ قیام — ہے اسیری سے شہی بس ایک گام

تو خودی کی سوچ، مردِ کار بن — مردِ حق بن، حاملِ اسرار بن

اب کروں گا فاش میں سرِّ نہاں — تجھ کو اوروں کی سنا کر داستاں

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں[۱]

گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

۱؎ شعر مولانا روم، ترجمہ: "اچھا یہی ہے کہ دلبروں کے راز دوسروں کے قصوں میں چھپا کر (کنایۃً) بیان کیے جائیں۔"

۱۳

پیاسے پرندے کی حکایت

اک پرندہ پیاس سے تھا بیقرار ‎ ‎ اُڑ رہا تھا ہر طرف دیوانہ وار

اُس نے دیکھی ایک ہیرے کی کنی ‎ ‎ چمچماتی، جیسے نیزے کی انی

جھٹ سے اس کی عقل نے لی آنکھ موند ‎ ‎ وہ سمجھ بیٹھا کہ ہے پانی کی بوند

پھر وہ جھپٹا ریزۂ الماس پر ‎ ‎ تاکہ اس کی چونچ ہو پانی سے تر

بولا ہیرا "اے گرفتارِ ہوس ‎ ‎ تیز کر مجھ پر نہ منقارِ ہوس

میں کوئی پانی نہیں، ساقی نہیں ‎ ‎ تجھ میں اتنا ہوش بھی باقی نہیں؟

مارتا ہے چونچ کیوں اے بے شعور ‎ ‎ توڑ سکتا ہوں میں منقارِ طیور

میں تو انساں کے لیے بھی قہر ہوں ‎ ‎ پیٹ میں اس کے اتر کر زہر ہوں"

جب نہ طائر کی بجھی ہیرے سے پیاس ‎ ‎ ہو گیا بے چین، ٹوٹی اس کی آس

وہ وہاں سے آہ کر کے اُڑ گیا ‎ ‎ اڑتے اڑتے اک طرف کو مڑ گیا

پھر اچانک پڑ گئی اس کی نظر ‎ ‎ قطرۂ شبنم پہ جو تھا پھول پر

مستعار اس کی چمک تھی مہر سے ‎ ‎ کانپتا تھا پھر بھی اس کے قہر سے

جیسے اک تارا فلک سے ٹوٹ کر ‎ ‎ سیر کرتا آگیا ہو پھول پر

آنکھ جس کی ہو تماشا آشنا ‎ ‎ ریزۂ ہستی سے مگر ناآشنا

جیسے اک آنسو سرِ مژگانِ یار ‎ ‎ جو ٹپکنے کے لیے ہو بیقرار

جب وہ طائر بن کے خطرہ آگیا
جھٹ سے اس کے منہ میں قطرہ آگیا

تو بتا، دشمن سے بچنا ہو اگر
قطرۂ شبنم ہے اچھا یا گہر؟

پیاس سے جب مرغ بے قابو ہوا
دوسروں کی جان کا دشمن ہوا

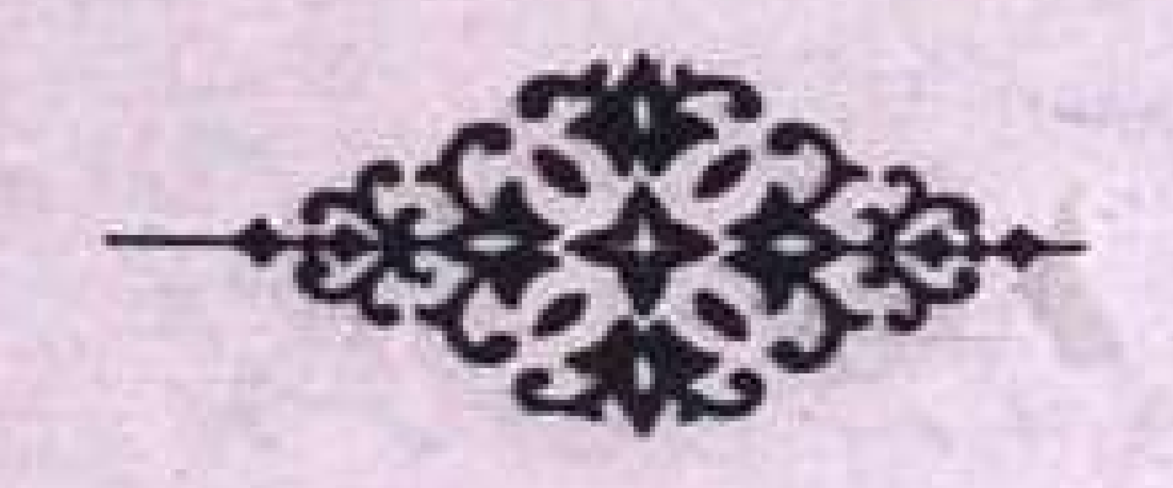
قطرہ نرمی کے سبب نابود تھا
چونکہ ہیرا سخت تھا، موجود تھا

تو خودی سے ہو کے غافل، کم نہ بن
ریزۂ الماس بن، شبنم نہ بن

تو جو پختہ صورتِ کہسار ہو
حاملِ صد ابرِ دریا بار ہو

خود کو محکم کرلے تو ایجاب سے
جم کے بن جا وسیمؔ تو سیماب سے

پھر خوشی سے چھیڑ کر تارِ خودی
آشکارا کردے اسرارِ خودی



(١٤)

ہیرے اور کوئلے کی حکایت

کوئلے نے یہ کہا الماس سے
رہنے والے دونوں ہم اک ساتھ کے

ایک جیسی ہے ہماری ہست و بود
ہے ہماری مشترک اصلِ وجود

میں نہیں سمجھا ہوں پھر یہ آج تک
ہے رسائی تیری کیسے تاج تک

اور میں اتنا ذلیل و خوار ہوں
سچ تو یہ ہے زیست سے بیزار ہوں

رنگ تیرا صاف، کالا ہے مرا
میں ہوں ارزاں، نرخ بالا ہے ترا

تیرا چہرہ شیشۂ شفاف ہے
میں خزف ریزہ یہ کیا انصاف ہے

مجھ کو ٹھوکر میں اڑاتے ہیں سبھی
آگ میں مجھ کو جلاتے ہیں سبھی

کیوں نہیں روتا ہے میرے حال پر
جب ہے تجھ کو میری حالت کی خبر

میں بکھر جاتا ہوں بن بن کر دھواں
مجھ سے ہوتی ہیں جدا چنگاریاں

اور تارے کی طرح تیری ضیا
تیرے ہر پہلو کا جلوہ ہے نیا

ہے کہیں پر دستۂ خنجر میں تو
اور کہیں ہے خاتمِ قیصر میں تو"

تب کہا الماس نے "اے نکتہ بیں
خاک پختہ ہو کے بنتی ہے نگیں

جنگ ہوتی ہے بطونِ خاک میں
ذرّے لڑتے ہیں دلِ صد چاک میں

سخت مثلِ سنگ پھر بنتا ہوں میں
تاج کے پاسنگ پھر بنتا ہوں میں

پختگی سے میرے پیکر میں ہے نور
مجھ میں رنگا رنگ جلوے مثلِ حور

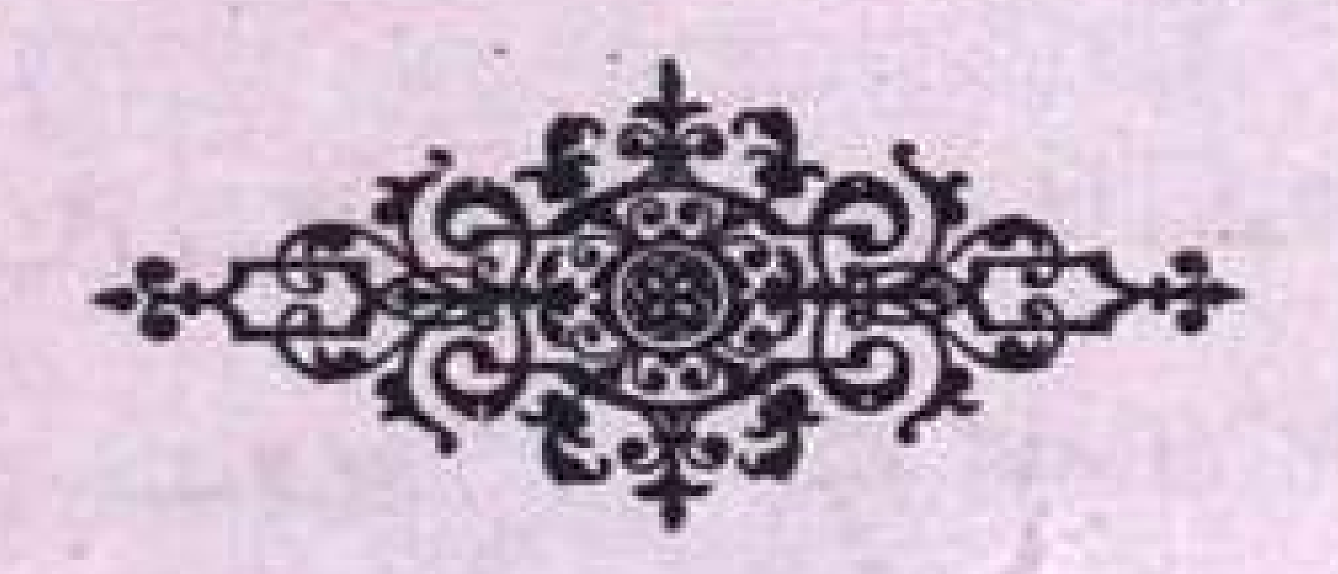
روز و شب مجھ سا تپا کر جان و تن
پہلے سنگ سخت پھر الماس بن

ہیں یہاں جو سخت کوش و سخت گیر
ہے انھیں کے دم سے دنیا مستنیر

سنگِ اسود گرچہ مشتِ خاک ہے
پھر بھی وجہہِ رشک نُہ افلاک ہے

مرتبے میں طور سے برتر ہے وہ
بوسہ گاہِ اسود و احمر ہے وہ

ہے صلابت آبروئے زندگی۔
ناتوانی، بے کسی، ناپختگی۔



۱۵

حکایت شیخ و برہمن

اک برہمن تھا بنارس میں مقیم
تھا شناسائے روایاتِ قدیم

ماہرِ حکمت تھا وہ مردِ فرید
عارفانِ حق کا تھا دل سے مرید

ذہن اس کا تیز و ندرت کوش تھا
وہ فلک پیما، فلک بردوش تھا

شعلۂ فکر اس کا اتنا گرم و تیز
مہر و مہ بھی اس سے کرتے تھے گریز

فکر میں اس کی جو تھا سودائے خام
تھا مئے عرفاں سے خالی اس کا جام

مدتوں راحت سے برگشتہ رہا
فکر کے میداں میں سرگشتہ رہا

پر خرد کے دام میں وہ مردِ پیر
کر نہ پایا طائرِ معنیٰ اسیر

گرچہ تھا دانائے اسرارِ فلک
قلبِ ہستی کی نہ دیکھی تھی جھلک

ایک دن لے کر وہ قلبِ ناصبور
آگیا اک شیخِ کامل کے حضور

جب مخاطب اس سے تھے شیخِ زمن
سن رہا تھا غور سے وہ برہمن

شیخ بولے " اے حکیمِ سربلند
آسماں پر ڈالنے والے کمند!

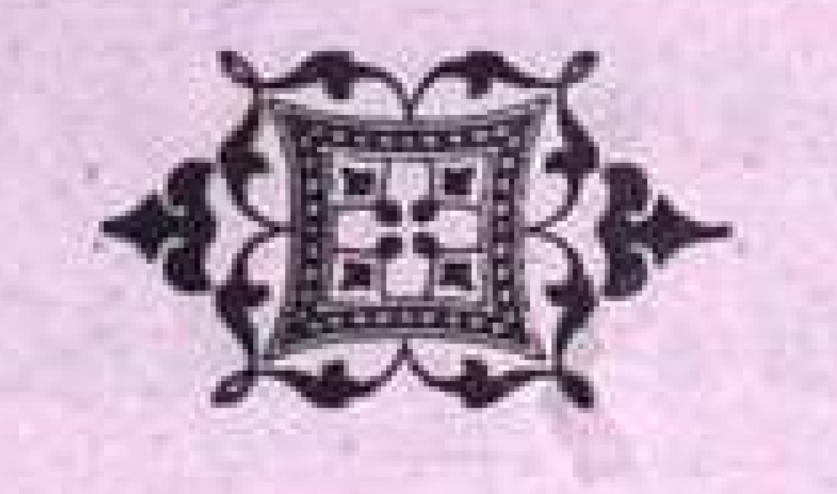
اے کہ دلدادہ ہے تو افلاک کا
حق ادا کرنا ہے تجھ کو خاک کا

بن میں یوں آوارہ پھرتا، کب تلک
فکر کو رکھے گا بالائے فلک!

آ زمیں پر پھر سے اے گردوں نورد
یہ نہیں کہتا کہ بت بیزار بن
اپنی تہذیبِ کہن سے منہ نہ موڑ
گر ہے جمعیّت سے ملت استوار
تو کہ اپنے کفر میں کامل نہیں
دُور تو آزر، میں ابراہیم سے
ہم جو دونوں عشق میں کامل نہیں

چھوڑ تاروں کا سفر، آسوئے گرد
کفر والے! لائق زنار بن
مسلکِ آبا کو تو ہرگز نہ چھوڑ
کیوں نہ رکھے کفر کو بھی برقرار
قابلِ طوفِ حریمِ دل نہیں
دُور دونوں جادۂ تسلیم سے
اب بھی دونوں بر سرِ منزل نہیں

ہم میں جب روشن نہیں شمعِ خودی
یہ فلک پیمائیاں کس کام کی



۱۶

مکالمۂ گنگ و ہمالہ

کوہ کے دامن میں جب کوئی نہ تھا
"ندّیوں کی مالا پہنے" یخ بدوش
گو بلندی میں بہت مشہور ہے
جب تجھے عادت پڑی آرام کی
زندگی میں جب نہ ہو لطفِ خرام
کوہ نے دریا کا جب طعنہ سنا
"میرے جوہر تیرے آئینے میں ہیں
تیرے چلنے میں ہے سامانِ فنا
ہستیٔ قلزم میں کھو جاتی ہے تو
اپنی کمزوری پہ یوں نازاں نہ ہو
جانتا ہوں میں کہ گردوں زاد ہے
مثلِ بو، دوشِ ہوا پر یوں نہ گھوم
زندگی اپنی جگہ بڑھنے کا نام
ہو گئیں صدیاں یہیں پر ہوں کھڑا

رودِ گنگا نے ہمالہ سے کہا
اے ہمالہ تو ازل سے ہے خموش
دو قدم چلنے سے بھی معذور ہے
رفعت و شوکت ترے کس کام کی
عیشِ دو عالم بھی ہوتا ہے حرام"
آ کے غصّے میں وہ یوں گویا ہوا
تجھ سے سو دریا مرے سینے میں ہیں
بہہ رہی ہے لے کے ارمانِ فنا
اس سے مل کر ایک ہو جاتی ہے تو
ہو! مگر تجھ سا کوئی ناداں نہ ہو!
تجھ سے بہتر ساحلِ افتادہ ہے
پھول بن کر اپنی ہی ڈالی پہ جھوم
اپنے بل بوتے پہ ہے چڑھنے کا نام
جانتی بھی ہے کہ ہوں کتنا بڑا!

بڑھتے بڑھتے ہوں فلک کا ہم رکاب
گود میں میری ثریا محوِ خواب

کھو گئی ہستی سمندر میں تری
چومتا ہے چاند پیشانی مری

میری نظروں میں ہیں اسرارِ فلک
میں سنا کرتا ہوں پروازِ ملک

دیکھ سوزِ سعیِ پیہم کا اثر
جمع مجھ میں لعل و الماس و گہر

"مجھ میں پتھر اور پتھر میں ہے آگ
آگ وہ جس سے نہیں پانی کو لاگ"

بوند سی کیوں گر رہی ہے خاک پر
بن کے اک طوفاں سمندر سے گزر

یا صدف میں جا کے گوہر ریزہ بن
گوشِ دلبر کے لیے آویزہ بن

بھاپ بن کر یا سبک رفتار بن
ابرِ برق انداز و گوہر بار بن

دے سمندر کو تو طوفانوں کی فوج
ہو تری مرہون اس کی موج موج

ہو سمندر بھی ترا دریوزہ گر
اپنا سر رکھ دے وہ تیرے پاؤں پر



۱۷

اسلام اور جنگ

رنگ[1] بھر دل میں تو اس کی چاہ کا — سب سے بہتر رنگ ہے اللہ کا
تو اے مسلم، مسلم صادق نہیں — بلکہ کافر ہے اگر عاشق نہیں
تابعِ[2] حق مردِ عاشق کا شعار — اس کا طرزِ فکر، اس کا طرزِ کار
اُس کا آنکھیں بند کرنا کھولنا — اُس کا کھانا پینا ہنسنا بولنا
اس کی مرضی مرضئ مولیٰ میں ضم — عام لوگ اِس بات کو سمجھیں گے کم
اس کی اِلا اللہ پر ہر دم نگاہ — ہے عوام[3] الناس کے اوپر گواہ

---

[1] اِس آیت قرآنی کی طرف تلمیح "وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً" (کہہ دو کہ) اور اللہ سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے؟

[2] شعر ۳ تا ۵ میں سورۂ انعام کی اس قرآنی آیت کی ترجمانی ہے "قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ..... الخ (کہو بے شک میری نماز، میرا حج، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے)

[3] شعر ۶۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۴۳) میں آیا ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا (اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین (متوازن) امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسولِ خدا تم پر گواہ بنیں)۔ مذکورہ اشعار میں اسی آیت مقدسہ کی طرف تلمیح ہے۔

اس کے شاہد ہیں نبیؐ انس و جاں — جن کی سچائی ہے بالائے گماں

قال سے صرفِ نظر کر حال بن — تو عدوئے ظلمتِ اعمال بن

خسروی ملبوس میں درویش بن — تو خدا ترس و خدا اندیش بن

ہر عمل میں قربِ حق مقصود ہو — بس اسی تک ہر قدم محدود ہو

صلح بھی شر ہے جو ہے مقصودِ غیر — جنگ ہو اللہ کے حق میں تو خیر

تیغ سے جب ہو نہ نامِ حق بلند — جنگ ہے پھر قوم کے حق میں گزند[1]

حضرتِ شیخ[2] میاں میرِ ولی — ذکر سے جن کے کھِلے دل کی کلی

تھے طریقِ مصطفیٰؐ پر گامزن — ذکرِ حق سے تھے چمن اندر چمن

مرجعِ ہر مرد و زن ان کا مزار — اہلِ ایماں کا ختن، ان کا مزار

اُن کے در پر جبہہ فرسا آسماں — تھا مریدوں میں شہِ ہندوستاں

شاہ پر طاقت کا چھایا تھا خمار — ملک گیری کی ہوس کا تھا شکار

تھی لہو کی پیاس کچھ اتنی شدید — تیغ اس کی کہتی تھی "ہل من مزید"

جب دکن پر تھا جو جھگڑوں سے نڈھال — شاہ کو آیا چڑھائی کا خیال

شیخ کے دربار میں حاضر ہوا — تاکہ اس کے حق میں فرمائیں دعا

جب بھی کوئی کام کرتے ہیں شروع — کرتے ہیں مسلم بزرگوں سے رجوع

تھے سبھی بہرِ دعا سر تا پا گوش — سر جھکائے شیخ تھے لیکن خموش

قفل خاموشی کی پھر بن کر کلید — چند درہم لے کے اٹھا اک مرید

شیخ سے کی عرض "اے شانِ رسولؐ — کیجیے احقر کا نذرانہ قبول

---

[1] ان اشعار میں وَ قاتلوا فی سَبیلِ اللہِ ۔ ۔ ۔ ۔ لَا یُحِبُّ المُعتَدِین: سورۃ بقرہ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۲) کی تشریح ہے (اور تم انھیں اللہ کی راہ میں قتل کرو۔۔۔ (مگر زیادتی نہ کرو)۔ خدا زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ [2] حضرت شیخ میاں میرؒ۔ سندھ کے مشہور ولی۔

دو ٹکوں کی بات ہی کیا ہے حضور / پر یہ محنت کی کمائی ہے ضرور"

شیخ بولے کر کے سلطاں پر نظر / "مستحق وہ ہے، اسے خیرات کر

ہے کھڑا در پر لگائے کب سے آس / وہ گدا پہنے ہوئے شاہی لباس

بات الٹی ہے مگر کر لے یقین / اپنا یہ سلطان ہے مفلس ترین

بھوک سے رہتا ہے مضطر اس قدر / ہے جہاں بھر کے نوالوں پر نظر

آگ اس کی پیٹ کی یہ الاماں / جس نے خاکستر کیے کتنے مکاں!

قحط اور طاعون پھیلاتا ہے یہ / اک بلا عالم کے سر لاتا ہے یہ

خلق اس کی مفلسی سے خوار ہے / ہے ضعیف اور خود ضعیف آزار ہے

اس کی سطوت، دشمنِ اہلِ جہاں / لوٹ لیتا ہے یہ رہزن کارواں

خود فریب اتنی ہے اس کی فکرِ خام / لوٹ کو "تسخیر" کا دیتا ہے نام

لشکرِ شاہی ہو یا فوجِ غنیم / دونوں تیغِ جوع سے اس کی دونیم

آتشِ جانِ گدا جوعِ گدا / جوعِ سلطاں ملک و ملت کی فنا

بہرِ غیر اللہ جو کرتا ہے وار
تیغ کا اپنی ہی ہوتا ہے شکار



١٨

فرمودات میر نجات المعروف بہ بابا صحرائی

جس گھڑی مٹی سے تو پیدا ہوا — تھا خودی کا تیری گردن پر جوا

کر خودی محکم، بقا انجام بن — قطرہ ہونے پر بھی بحر آشام بن

اُس خودی کو جو ہے تجھ میں ضو فشاں — کر کے مستحکم تو ہو جا جاوداں

منفعت دے گا بہت، سودا ترا — پیڑ بن جائے گا یہ پودا تیرا

ہو کے زندہ، موت سے ڈرتا ہے تو — میں ترے قرباں! غلط سمجھا ہے تو

جانتا ہوں برگ و سازِ زندگی — اس لیے سن مجھ سے رازِ زندگی

پہلے خود دریا میں غوطہ مارنا — پھر نکل کر خود سے، خود پر وارنا

راکھ میں اپنی چھپانا کچھ شرر — شعلہ بن کر خیرہ کرنا ہر نظر

جس[1] کے بننے میں لگیں چالیس سال — شعلہ بن کر اس مکاں کو پھونک ڈال

اپنے ہی شعلے کا کرتا رہ طواف — گرچہ ہے وضع زمانہ کے خلاف

خود کو سمجھے گا اگر بیت الحرام — غیر کا پھر تو نہیں ہوگا غلام

اُڑ کے، جذبِ خاک سے کر جا فرار — مثلِ طائر رہ ہوا میں برقرار

تو نہیں گر طائرِ گردوں گزر — کوہ پر پھر آشیاں بندی نہ کر

---

[1] خود کو نظر انداز کر کے کی ہوئی چالیس سالہ ریاضت کی طرف اشارہ ہے۔

تو اگر ہے شائقِ کسبِ علوم — سن لے مجھ سے یہ پیامِ پیرِ روم

"علم را بر تن زنی مارے بود[1]
علم را بر دل زنی یارے بود"

مجھ سے اب سُن قصۂ اخوندِ روم — جب حلب میں تھا وہ استاذِ علوم

تھا وہ زنجیریِ توجیہاتِ عقل — تھی اسے گھیرے ہوئے ظلماتِ عقل

تھا ابھی بیگانۂ سینائے عشق — ہاتھ میں اس کے نہ تھا مینائے عشق

جس گھڑی بابِ[2] تشکک کھولتا — سننے والوں کا عقیدہ ڈولتا

روشنی جب ڈالتا[3] اشراق پر — عقلِ انسانی کو رکھتا طاق پر

قولِ[4] مشائیں کی گرہیں کھول کر — وہ لٹاتا علم و دانش کے گہر

---

[1] ترجمہ: "اگر علم کو تن (مادی فوائد) کے لیے استعمال کرے گا تو وہ (تیرے حق میں) سانپ بن جائے گا اور اگر اسے دل (یعنی روحانی مقاصد) کے لیے استعمال کرے گا تو یہ علم تیرا دوست بن جائے گا۔

[2]، [3]، [4] ان اشعار میں فلسفۂ الٰہیات کی ان چند اہم شاخوں کا ذکر ہے جن میں مولانا کو دستگاہ تھی۔ تشکک (SCEPTICISM) کے پیرو عقلی دلائل کی بنیاد پر حصولِ علم کے امکانات کی نفی کرتے ہیں اور الہامی مذاہب کی صداقتوں کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مولانا الٰہیات کی اس شاخ کے پیچ و خم سے واقف تھے۔ اسی طرح وہ اپنے مکتب میں علم اشراق اور علم مشائین کا بھی درس دیتے تھے۔ حکمائے سلف کا ایک گروہ دروں بینی کے ذریعے مابعد الطبیعاتی حقائق جاننے کا دعویٰ کرتا تھا۔ اس مسلک کو اشراق (لغوی معنی روشنی دینا) یا اشراقیت کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف یونانی فلسفیوں کا ایک گروہ جو ارسطو کے شاگردوں پر مشتمل تھا حقیقت اشیا کی دریافت باہمی مباحثوں اور عقلی دلائل کے ذریعے کرتا تھا۔ وہ "مشائین" کہلاتے ہیں۔ علم اِشراق و علم مشائین میں بعد المشرقین ہے لیکن مولانا ان تمام علوم پر عبور رکھتے تھے اور ان کا درس دیتے تھے۔ ذوقؔ کا یہ شعران پر صادق آتا ہے۔

ع کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں پیش روی — کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پہ میں سبقت

آس پاس اس کے تھا انبارِ کتب — تھی لبوں پر شرحِ اسرارِ کتب

کر رہے تھے شمس[1] از حکم کمال — جستجوئے مکتبِ ملا جلال

آیا جب مکتب میں وہ مردِ خدا — درسِ رومی دیکھ کر اس نے کہا

"بحث کیسی ہے"؟ یہ قیل وقال کیوں؟ — یہ قیاس و وہم و استدلال کیوں؟

مولوی بولا "نہیں جس فن میں طاق — کس لیے اس کا اڑاتا ہے مذاق؟

تو نہیں سمجھے گا کیا ہے قیل وقال — بے سروپا وسوسے دل سے نکال

ہے ترے ادراک سے یہ بالاتر — اس بلندی پر نہیں تیرا گزر"

دیکھ کر رومی کا طرزِ ناروا — جانِ تبریزی سے اک شعلہ اٹھا

شعلہ بار آنکھوں سے اک بجلی گری — جس میں جل کر خاک بھی شعلہ بنی

خرمنِ ادراک سارا جل گیا — دفتر کا واک سارا جل گیا

مولوی سمجھا نہ یہ اعجازِ عشق — تھا ابھی بیگانۂ اندازِ عشق

بولا "یہ تو نے لگائی آگ کیوں؟ — دفترِ حکمت سے اتنی لاگ کیوں"؟

شیخ بولا "تو خرد کا ہے غلام — ذوق و وجد و حال سے کیا تجھ کو کام!

تو کہ ہے دیوانۂ قیل و قال کا — حال کیا سمجھے گا ذوقِ حال کا

پاس تیرے عقل کا مقیاس ہے — کیمیائے سرخ میرے پاس ہے

کیا ہے حکمت مغز ماری کے سوا — پائے گا کیا برف باری کے سوا

آگ پیدا کر خس وخاشاک سے — شعلہ کر تعمیر اپنی خاک سے

سوزِ دل سے علم کا اتمام ہے۔ — ترکِ آفل[2] معنیِ اسلام ہے

بندِ آفل توڑ کر آزاد تھا
ابنِ آزر آگ میں بھی شاد تھا

---

[1] "شمس" سے مراد شمس تبریزی اور کمال سے مراد بابا کمال الدین جو شمس تبریزی (اگلے صفحہ پر)

علمِ حق کو چھوڑ کر پیچھے کہیں	داؤں پر تو نے لگایا نقدِ دیں
تو تلاشِ سرمہ میں دل تنگ ہے	گرچہ تیری آنکھ سرمہ رنگ ہے
چاہے تو خنجر میں ڈھونڈ آبِ حیات	ڈھونڈ منہ میں سانپ کے قند نبات
سنگِ اسود مانگ لے بتخانے سے	مانگ پانی چاہے تو آئینے سے
پر نہ کر ہرگز تلاشِ کیشِ عشق	عصرِ نو میں، جو ہے بد اندیشِ عشق
مدتوں محو تگ و دو میں رہا	اس نئی منزل کا رہرو میں رہا
باغباں نے لے کے میرا امتحاں	اس گلستاں کا بنایا رازداں
دانشِ نو کی حقیقت جان لی	اس میں ہے کتنی صداقت، جان لی
اک طلسمی باغ جو ہے دیدہ زیب	کاغذی پھولوں میں خوشبو کا فریب
جب سے چھوڑا ہے یہ میں نے گلستاں	شاخِ طوبیٰ پر ہے میرا آشیاں
دانشِ حاضر کا پیشہ ساحری	بت پرستی، بت فروشی، بت گری

(مسلسل) کے پیر تھے اور انھیں کے ایما پر مولانا شمس تبریزی ملا جلال (مولانا جلال الدین رومی) سے ان کی درس گاہ میں نیاز حاصل کرنے کے لیے حلب آئے تھے۔ اس شعر میں اسی بات کا ذکر ہے۔

لے، سے آفِل کے لغوی معنی ہیں۔ نیچے جانے والا ڈوبنے والا۔ یہ لفظ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (میں ڈوبنے والوں کو عزیز نہیں رکھتا) سے ماخوذ ہے۔ سورۂ انعام کی آیات ۷۶ تا ۷۹ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیم پہلے، ایک ستارے کو دیکھ کر اسے خدا سمجھتے ہیں اور جب وہ ڈوب جاتا ہے تو اسے رب ماننے سے انکار کرتے ہیں، اسی طرح وہ پھر چاند اور اس کے بعد سورج کو خدا مان کر ان کے ڈوب جانے پر ان کی خدائی سے انکار کرتے ہیں۔ جب ستارہ ڈوب گیا تو آپ نے فرمایا:

"لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ" یہاں ترک آفل سے مراد غیر اللہ کو ترک کرنا اور بند آفل سے آزاد ہونے کے معنی خدا کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز ہونے کے ہیں۔

وہ ہے زندانِ مظاہر کی مکیں
ہے حدودِ حس کے اندر جاگزیں

بن گئی ہے اپنے ہی حق میں بلا
اپنا خنجر اور اپنا ہی گلا

آگ اس کی مثلِ لالہ سرد ہے
جانے کب ٹوٹے کہ برگِ زرد ہے

عشق سے بیگانگی ہے اس کی خو
اس کو رکھتی ہے پریشاں جستجو

عشق، جالینوس بیماریِ عقل
عشقِ سودا پیشہ میں خواری عقل

سارا عالم ساجد اور مسجود عشق
سومنات عقل کا محمود عشق

عقل تن آساں میں ہے یاتوں کا زور
عشق کی راتوں میں ہے "یارب" کا شور

اپنے سروِ قد سے کر کے آنکھ بند
دوسروں کے قد کو سمجھا ہے بلند

خود سے خالی کر کے خود کو مثل نے
ہو رہا ہے سن کے خوش اوروں کی لے

اے گدائے ریزہ چینِ خوانِ غیر
تیرا تن ہے مایہ دارِ جانِ غیر

بجھ گیا مسلم چراغِ غیر سے
جل گئی مسجد شرارِ دیر سے

جیسے ہی آہوئے حرم آزاد تھا
کب شکارِ ناوکِ صیاد تھا

ڈر ہے اپنے شعلے سے ہو کر فرار
بجھ نہ جائے تو کہیں مثلِ شرار

اے امینِ حکمتِ ام الکتاب
وحدت گم گشتہ کے پھر دیکھ خواب

چھوڑ بیٹھا اپنی ملت کا حصار
کر نہ دے کافر تجھے ترکِ شعار

انحصار کعبہ اور اصنام پر!
کفر ہنستا ہے ترے اسلام پر

دشمنِ اسلام ہے عشقِ صنم
چل پڑا ہے دیر کو شیخِ حرم

جو بزرگِ قوم ہیں پیری میں طاق
ہیں گلی کوچوں کے لڑکوں کا مذاق

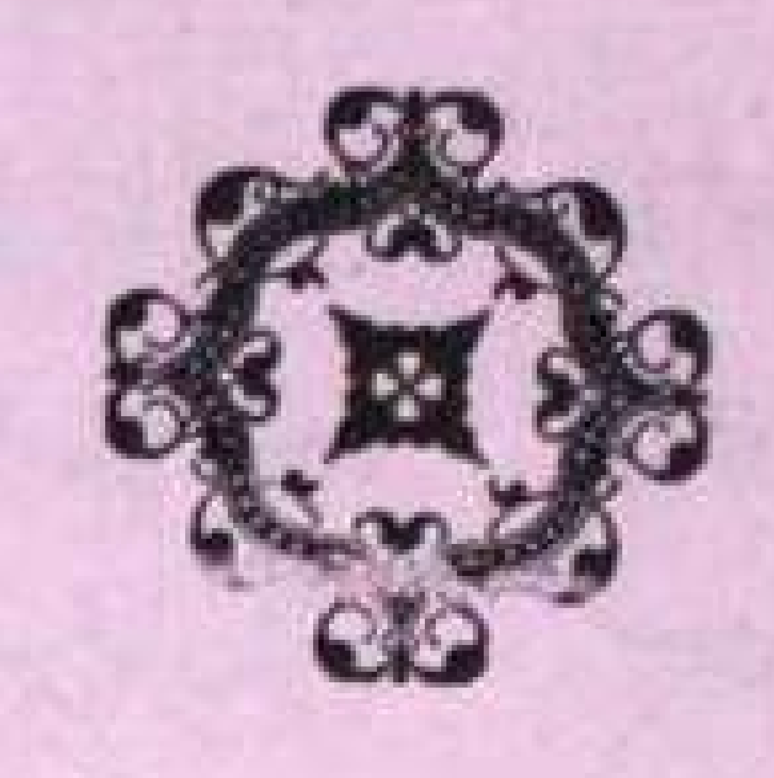
مٹ گیا سینے سے عشقِ لا الٰہ
دل ہے اصنامِ ہوس کی خانقاہ

چھوڑ کر گیسو ہمارے خرقہ پوش
بن گئے سوداگرانِ دیں فروش

ساتھ کرتے ہیں مریدوں کے سفر
قوم کی ان کو نہیں اصلا خبر

کم نظر ہیں، دور بینوں میں نہیں　　دل کی دولت ان کے سینوں میں نہیں
صوفی و ملاّ ہوس کا ہیں شکار　　ملتِ بیضا نے کھویا اعتبار
واعظانِ قوم ہیں ملت فروش　　مفتیٔ دینِ متیں، حرمت فروش

دوستو! اب کیا کریں تدبیر ہم
نکلا اپنا پیر شیدائے صنم



۱۹

الوقتُ سیفٌ

تھے ہمارے ایک عالمِ شافعیؒ — واقفِ سرّ زمانِ واقعی
ہو سدا سرسبز ان کی خاکِ پاک — فکر کی دنیا ہے ان سے تابناک
اے خوشا ان کا خیالِ فکر خیز! — جس کی رو سے وقت ہے شمشیرِ تیز
زندگی سے ربط اس شمشیر کا — جیسے رشتہ ہو کماں سے تیر کا
ہاتھ میں لے جو یہ شمشیرِ کریم — ہاتھ ہو روشن تر از دستِ کلیم
جو بھی یہ شمشیر رکھے اپنے پاس — چھو نہیں سکتے اسے خوف و ہراس
ضربتِ کاری سے جس کی سنگ آب — خشک کر دے بحر کو جس کا عتاب
ہاتھ میں موسیٰ کے یہ شمشیر تھی — ہاتھ میں شمشیر کیا تقدیر تھی
جس سے قلبِ بحرِ احمر چاک تھا — ایک دریا خشک ہو کر خاک تھا
دستِ حیدر میں یہی خیبر شکن — نعرۂ حق بن کے تھی مرحب فگن
تو نے سمجھا روز و شب کا یہ سفر — گردشِ گردوں ہی کا ہو گا اثر
تو اسیرِ دوش و فردا ہے تو خیر — ورنہ کہتا تجھ سے آ کر دل کی سیر
اندرونِ حس ہوا جب سے اسیر — وقت ہے تیری نظر میں اک لکیر
لے کے تو پیمانۂ لیل و نہار — ناپتا رہتا ہے طولِ روزگار
تو بنا کر وقت کو زنارِ دوش — بن گیا مثلِ بتاں باطل فروش
کیمیا ہو کر بھی مثلِ گِل بنا — سرِّ حق تھا، مایۂ باطل بنا

تو اگر مسلم ہے یہ زنار پھینک　　جو وبالِ دوش ہے وہ بار پھینک
روشنیٔ دیدۂ ابرار بن　　شمع بزمِ ملتِ احرار بن
جب ہے تو ناواقفِ اصلِ زماں　　کیا کہوں کیا ہے حیاتِ جاوداں
اے اسیرِ وقت، بن شہبازِ وقت　　"لی مع اللہ"[1] میں چھپا ہے رازِ وقت
کائناتیں سر کرے رفتارِ وقت　　زندگی اک مظہرِ اسرارِ وقت
گردشِ خورمیں نہیں اصلِ زماں　　اس کی قسمت میں فنا یہ جاوداں
بزمِ ماتم میں اگر ہے آہ وقت　　بزمِ عشرت کی بھی کھولے راہ وقت
وقت کو مثلِ مکاں پھیلا دیا　　دوش و فردا میں دوئی! یہ کیا کیا؟
مثلِ بو یوں چھوڑ کر اپنا چمن　　ہو گیا خود ہی گرفتارِ زمن
اول و آخر نہ دیکھے ہوں بھلے　　وقت دل کی گود میں پھولے پھلے
اس کا عرفاں ہو تو زندہ زندہ تر　　اس کی ہستی صبح سے تابندہ تر

لازم و ملزوم دہر و زندگی
"لا تسبوا الدہر"[2] ہے قولِ نبیؐ

---

[1] اشارہ ہے اس حدیث شریف کی طرف لِی مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْهِ نَبِیٌّ مُرْسَلٌ وَّ لَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ (میرے لیے ایک (خاص) وقت ایسا بھی ہوتا ہے جب میں خدا کے حضور میں ہوتا ہوں جہاں تک کسی نبی مرسل اور مقرب فرشتے کو بھی رسائی نہیں ہوتی) اقبال کی نظر میں یہ وقت وہ "زمانِ واقعی" ہے جو زمان مسلسل سے مختلف ہوتا ہے جسے ہم بپیمانۂ امروز و فردا سے ناپتے ہیں۔

[2] لاتسبوا الدہر کے معنی ہیں: زمانے کو دشنام نہ دو۔ وہ حدیث جس کا ذکر شعر میں آیا ہے مختلف الفاظ کے ساتھ ملتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

لاتسبوا الدھر فانّ اللّٰہ ھوالدھر (زمانے کو گالی مت دو کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے)

یعنی زمانہ خدا کے تصرف میں ہے اور اسی کی ایک شان ہے۔ اقبال اس حدیث کی روشنی میں وقت کو خدا اور خدا کو وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔

سن لے مجھ سے ایک نکتہ مثلِ دُر
تا کہ سمجھے امتیازِ عبد و حر

عبد کو کرتے ہیں گم لیل و نہار
اور مردِ حر میں گم ہے روزگار

عبد کے بس کے نہیں ہیں جان و تن
روز و شب سے اپنا بُنتا ہے کفن

عبد ہے مرغِ اسیرِ صبح و شام
لذتِ پرواز ہے اس پر حرام

سینۂ حُر ہے مگر تازہ نفس
طائرِ ایام کا بن کر قفس

عبد کی نظروں میں فطرت رائیگاں
وارداتِ دل سے خالی اک جہاں

بے دلی سے وہ کرے اک جا قیام
عبد کے ہیں بے تغیر صبح و شام

جبکہ حر ہے خالقِ لیل و نہار
دمبدم تو آفرین و تازہ کار

اس کی فطرت پاک ہے تکرار سے
دائرہ اس کا نہیں پرکار سے

عبد کے حق میں زماں زنجیر ہے
اس کے لب پر شکوۂ تقدیر ہے

ہمتِ حُر بن کے قدرت کی مشیر
حادثوں کو کرتی ہے صورت پذیر

اُس کے ہیں ماضی و مستقبل بھی حال
حر کے اک پل میں ہزاروں ماہ و سال

میرے اس دعوے میں ہو چاہے تضاد
ہے مرا دعویٰ مگر پُر اعتماد

کیسے معنی تنگ ہو لفظوں کا گزر
اس لیے معنی پر رکھ اپنی نظر

رمزِ معنی ماورائے حرف و صوت
حرف میں ڈھلنا ہی ہے معنی کی موت

دل میں پا یہ نکتۂ غیب و حضور
دیکھ دل میں رمزِ ایام و مرور

نغمۂ خاموش چھیڑے سازِ وقت
ڈوب جا دل میں کہ پائے رازِ وقت

وہ بھی کیا دن تھے کہ سیفِ روزگار
تھی ہمارے ہاتھ میں آموزگار

دینِ حق کی آبیاری ہم نے کی
اس جہاں کی پردہ داری ہم نے کی

اِس کے پھر عقدہ کشا بھی ہم رہے
خاک کے بخت رسا بھی ہم رہے

ہم پرانے میکدوں کو لوٹ کر
سب پرانی بندشوں سے چھوٹ کر

بادۂ حق خم بہ خم پیتے رہے
ہم صداقت کے لیے جیتے رہے

اے[1] کہ دنیا ہے ترے زیرِ نگیں
تو ہے خرمن کا ہمارے خوشہ چیں

بادۂ نخوت سے تو ہو کر مگن
ہے ہماری مفلسی پر طعنہ زن

تھا کبھی سکہ ہمارے نام کا
دور چلتا تھا ہمارے جام کا

عصرِ نو کے جلوہ ہائے پُر بہار
ہیں ہمارے دشت کا گرد و غبار

کرکے دنیا میں بلند آوازِ حق
ہم نے الٹا ہے زمانے کا ورق

اپنی مٹی سے بنا کر سو حرم
کر دیا دنیا کو ہم نے محترم

حق نے 'اقرار' کی ہمیں تعلیم دی
ہم نے اس کے رزق کی تقسیم کی

گو نہیں ہیں صاحبِ تاج و نگیں
ہم فقیر اب بھی گئے گزرے نہیں

تیری نظروں میں اگرچہ خوار ہیں
پھر بھی ہم مستِ مے پندار ہیں

ہم کو حاصل لا الٰہ کا اعتبار
ہے دو عالم کو ہمارا اعتبار

ہو کے فکرِ این و آں سے بے نیاز
ہم اٹھاتے ہیں کسی دلبر کے ناز

وارثِ موسیٰ ہیں ہم، ہارون ہم
کیونکہ ہیں مقصودِ کاف و نون ہم

آج بھی روشن ہیں ہم سے مہر و ماہ
آج بھی ہم برق کی جائے پناہ

آج بھی ہم جلوہ گاہِ ذاتِ حق ۔
ہستی مسلم میں ہیں آیاتِ حق ۔



---

[1] اس شعر اور اشعار مابعد میں اہلِ فرنگ سے خطاب ہے ۔

(۲۰)

دعا

اے دلآرامِ جہاں، جانِ جہاں ــ دور ہم سے کیوں ہے اے نزدیکِ جاں
نبضِ جاں چلتی ہے تیرے فیض سے ــ شمعِ جاں جلتی ہے تیرے فیض سے
راہ میں تیری، اے مقصودِ حیات! ــ موت بھی ہوتی ہے محسودِ حیات
پھر ہمارے سینے میں آباد ہو ــ تاکہ تسکینِ دلِ ناشاد ہو
پھر طلب کر ہم سے ننگ و نام کو ــ پختہ پھر کر دے مزاجِ خام کو
آج ہم رسوا سرِ بازار ہیں ــ تو گراں قیمت ہے، ہم نادار ہیں
روئے زیبا پر نقاب اپنی نہ ڈال ــ عام کر دے عشقِ سلمانؓ و بلالؓ
چشمِ بیخواب و دلِ بیتاب دے ــ پھر سے ہم کو فطرتِ سیماب دے
وہ[۱] نشانی پھر اتار اے سِرِّ دیں ــ جس نے دشمن کی جھکا دی تھی جبیں
کوہِ آتش خیز کر اِس کاہ کو ــ پھونک ڈالے تاکہ غیر اللہ کو
رشتۂ وحدت جو ہاتھوں میں نہیں ــ کتنی گرہیں ایک دھاگے میں پڑیں
ہم بچھڑ کر کارواں سے اک ہجوم ــ ہو گئے ہیں منتشر مثلِ نجوم

---

[۱] اس شعر میں اس آیت کی طرف تلمیح ہے: اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِیْنَ (اگر ہم چاہیں تو ان (حق کے ماننے والوں) پر آسمان سے نشانی اتار دیں پھر ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں)

پھر سے ان اوراق کو ترتیب دے　　پھر اخوت کی ہمیں ترغیب دے
عاشقوں کو اپنے پھر مجبور کر　　اپنی خدمت پر انھیں مامور کر
رہروؤں کو منزلِ تسلیم بخش　　قوتِ ایمانِ ابراہیمؑ بخش

عشق کا ہو منزلِ لا سے گزر
ہم پہ وا پھر راہ اِلا اللہ کر

میں کہ روتا ہوں زمانے کے لیے　　اہلِ محفل کو رُلانے کے لیے
دے مجھے یارب وہ اشکِ دلفروز　　بیقرار و مضطر و آرام سوز
جس کو بوؤں تو اُگیں شعلوں کے بن　　جس سے لالہ بھی ہو آتشِ پیرہن
آنکھ مستقبل پہ، دل ماضی میں مست　　بزم میں تنہا ہوں جامِ جم بدست
"تو بزعم خود ہمارا یار ہے　　وہ بھی کیا پائے ہمیں لاچار ہے"
اِس جہاں میں ہے کہاں میرا ندیم!　　نخل سینا ہوں تو دے میرا کلیم
اپنا جینا کر لیا میں نے وبال　　ایک شعلہ دل میں رکھا ہے سنبھال
جس سے غارت ہے مرا سامانِ ہوش　　جل رہا ہے دمبدم دامانِ ہوش
علم کو جس نے کیا خوار و زبوں　　جس سے سیکھے عقل، آدابِ جنوں
مہر جس کے سوز سے آتش لباس　　بجلیاں پھرتی ہیں جس کے آس پاس
مثلِ شبنم دل بہت گریاں ہوا　　تب امینِ شعلۂ پنہاں ہوا
شمع کو جلنا سکھا کر برملا　　اس قدر چھپ چھپ کے دل جلتا رہا
ہر بُنِ مو سے مرے شعلے اُگے　　جن سے بلبل نے شرارے چن لیے
کر کے پیدا نغمۂ آتش مزاج　　میرے دم سے خوشنوا بلبل ہے آج
ہے زمانہ میرا خالی سوز سے　　میں ہوں سوزاں اِس غمِ دلدوز سے
پر اکیلا جل کے کچھ حاصل نہیں　　کوئی پروانہ مرے قابل نہیں
رازداں میرا، نہ کوئی غمگسار　　میں کروں کب تک کسی کا انتظار

اب سہا جاتا نہیں بس! اے خدا
اپنا شعلہ لے لے واپس اے خدا

چھین لے اپنی امانت چھین لے
دل سے احساسِ ندامت چھین لے

یا مجھے اک ہمدمِ دلدار دے
جس پہ دل میرا یہ سب کچھ وار دے

موج ہے دریا میں ہم پہلوئے موج
کھیلنا ہم جولیوں سے خوئے موج

ہر ستارہ اپنے ہمدم کے قریب
چاند کو بھی شب کا پہلو ہے نصیب

دن بھی ہم پہلوئے شب ہے وقتِ شام
سینۂ امروز ہے فردا مقام

ڈوبتی ہے آبجو میں آبجو
بوٗ میں گم ہو کر ہوا ہے مشکبوٗ

رقص میں ہر ذرۂ دیوانہ ہے
رقص میں دیوانہ بادیوانہ ہے

ہو کے یکتا تو نے بھی تو اے خدا
یہ جہاں اپنے لیے پیدا کیا

دیکھ مجھ کو، لالۂ صحرا ہوں میں
ہے بھری محفل مگر تنہا ہوں میں

مجھ کو بھی یارب ہو اک ہمدم نصیب
جو ہمیشہ ہو مرے دل کے قریب

ایسا دیوانہ جو فرزانہ بھی ہو
فکرِ این و آں سے بیگانہ بھی ہو

اپنی 'ہو' دے کر اسے اپناؤں میں
دل کے آئینے میں اس کو پاؤں میں

پھر مری مٹی سے اک پیکر بنے
جس کا میں او رجو مرا آزر بنے



کسی قوم کی متاعِ بے بہا مادّے کے وہ بھاری بھر کم تودے نہیں ہوتے، جو اس کی سرزمین کے طول و عرض میں کارخانوں، آبی بند، نہروں، جھیلوں اور مادّی ترقیات کے منصوبوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ وہ عالی دماغ افراد اور ان کے علمی، فکری اور تخلیقی کارنامے ہوتے ہیں جو قوم کے وجودِ معنوی میں نو بہ نو زندگی کی لہریں بن بن کر دوڑتے اور اسے زندہ و پایندہ رکھتے ہیں۔ معاشی وسائل کا کسی قوم کے وجودِ ملّی میں وہی مقام ہے جو جسم میں پیٹ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ فکری تخلیقات کا منبع جسم انسانی میں بلند ترین مقام پر رکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اقدار کا شاعر ہے۔ ابدی حقیقتوں کا علم بردار ہے۔ وہ قدریں جو دل و دماغ اور روح میں پرورش پاتی ہیں۔ عقیدے کی سچّائیوں سے جنم لیتی ہیں۔ اور بدن کے کپڑوں کی طرح نہ پھٹتی ہیں، نہ میلی اور پرانی ہوتی ہیں۔ وہ چاند سورج اور ستاروں کی طرح روشن، بلند اور ابدی وجود رکھتی ہیں۔ نئے اور پرانے کی تقسیم کو اقبال خود دلیل کم نظری قرار دیتا ہے۔

علامہ اقبال کی یہ سب سے پہلی شعری تصنیف "اسرارِ خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ شائع ہوتے ہی یہ مثنوی برِصغیر کے اہلِ علم و تصوّف کی توجّہ کا مرکز بن گئی۔ اس کا سبب "اسرارِ خودی" کا موضوع اور علامہ اقبال کے مجتہدانہ خیالات تھے تاہم اس وقت کسی شخص کو بھی اسے اُردو میں منتقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ غالباً اس لیے کہ اس وقت فارسی علمی زبان تھی اور قریب قریب ہر تعلیم یافتہ شخص اسے بآسانی سمجھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر نکلسن وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی علامہ اقبال کی کسی تصنیف کا کسی زبان میں پہلا ترجمہ تھا اور تراجم اقبال کے اس سلسلے کا آغاز بھی اس کتاب کے ترجمے سے ہی ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید نے اُردو ترجمے کے لیے علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق مثنوی اسرارِ خودی کا انتخاب کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ مثنوی علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو بیان کرنے کے لیے ان کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف ہے۔ پھر اُسی اسرارِ خودی کی نے آگے بڑھ کر ان کے سارے کلام اور فلسفۂ زندگی میں رواں دواں دکھائی دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے منظوم ترجمے عکسِ اسرارِ خودی میں علامہ اقبال کی اس بامقصد مقدّس خواہش کا سب سے زیادہ احترام کیا ہے اسی لیے ان کے منظوم ترجمے نے ایک ایسے خلا کو پُر کیا ہے جو علامہ اقبال کی تخلیق اسرارِ خودی کا مقصود تھا۔